عليكم انفسكم لا يضركم من ضل اذا اهتديتم

طلوع اسلام

ستمبر ۱۹۳۹ء

ایک روپیہ

معراجِ انسانیت

قرآنی سیرتِ سرورِ کائنات علیہ التحیۃ والسلام

وہ عظیم القدر تصنیف جس کی نظیر اسلامی لٹریچر میں نہیں مل سکے گی۔

جناب پرویز کے بیس سالہ تدبر فی القرآن اور عظمت و عقیدت حضور ختم المرسلینؐ کا حسین و نادر امتزاج۔ قریب نو سو صفحات پر پھیلی ہوئی بصیرت افروز کتاب۔ کاغذ اعلیٰ درجہ کا ولایتی گلیزڈ۔ جدولی تزئین و تجمیل کے لئے عمل چغتائی کے چند نادر شاہکار۔ "نذرِ عقیدت" کے لئے منشی محمد یوسف دہلوی کا قلم مرصع کار و زرنگار۔ اس وقت تک قریب تین چوتھائی کتاب چھپ چکی ہے۔

اگر آپ نے ابھی تک اپنے لئے جلد مخصوص نہیں کرالی تو بہت جلد ایک کارڈ لکھ دیجئے کہ پہلے ایڈیشن کے ختم ہونے کے بعد معلوم دوسرے ایڈیشن کی باری کب آئے۔

تاجرانِ کتب ایجنسی کے لئے جلد مطلع فرمائیں تاکہ ان کے شہر میں اوّلیت ان ہی کے حصہ میں آئے۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

زالبسن روڈ ——— کراچی

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

مرتب:- محمد یونس

بدل اشتراک سالانہ دس روپے
ششماہی چھ روپے
قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

جلد ۲ | کراچی۔ ستمبر ۱۹۴۹ء | نمبر ۹

فہرست

لمعات ۲
عید الضحیٰ ۹
(محترم پرویز صاحب)
اسلام کا آخری رکن ۱۵
(علامہ اسلم جیراجپوری)
باب المراسلات ۲۶
(۱) قربانی
(۲) والدین کی اطاعت
انسانی حیات اجتماعیہ میں تصور حکومت ۳۸
(حکیم حیدر زمان صاحب صدیقی)
اپنی آنکھ اور قرآن کی روشنی ۴۵
(محترم پرویز صاحب)
اسباب زوال امت ۵۷
(میرزا عبداللہ انور بیگ صاحب)
نقد و نظر ۶۹
اسباب زوال امت ۷۳
"ترین"
ذہنی غلامی ۷۹
جناب اسد ملتانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ہندوستان میں مسلمانوں کا مطالبۂ آزادی اس دعوے پر مبنی تھا کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں بسنے والے مسلمان ایک الگ قوم کے افراد ہیں اور غیر مسلم دوسری قوم کے افراد۔ یہ دعوےٰ اس مطالبہ کی تائید میں بطور ایک وکیلانہ حربہ کے استعمال نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ایک حقیقت نفس الامری پر مبنی تھا اور وہ حقیقت یہ تھی کہ اسلام نے تمام مدعیانِ ایمان کو، بلا امتیاز حدود مکانی، ایک قوم قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس دعوے کو فریق ثانی نے تسلیم کیا۔ اور مسلمانوں نے ایک الگ خطہ میں اپنی حکومت قائم کرلی۔ فالحمدُ للہ علیٰ ذالک۔

اس حکومت کے قیام کے بعد یہاں کے مسلمانوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ وہ مسلم لیگ جو تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کی جاتی تھی، اسے دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ ایک پاکستان کے مسلمانوں کی جماعت اور دوسری ہندوستان کے مسلمانوں کی۔ اور اس طرح خود ہی اپنے اس دعوے کی تغلیط کردی کہ مسلمان، بلا امتیاز حدود، ایک قوم کے افراد ہیں۔ اس فیصلہ کو یہ کہکر گوارا کرلیا گیا کہ ہندوستان اور پاکستان میں مشترکہ لیگ کا وجود بہت سی عملی اور سیاسی الجھنوں کا باعث تھا۔ اس لئے دونوں ملکوں میں الگ الگ جماعتوں کی تشکیل ناگزیر تھی۔ بہت اچھا!

ہندوستان میں مسلمان مختلف صوبوں میں بستے تھے اور صوبائی حدود ان میں امتیازی خطوط کا باعث بن گئے تھے۔ مطالبۂ آزادی کے وقت جب تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک قوم کے رشتہ میں پرو دیا گیا، تو ان صوبائی امتیازات کو لعنت قرار دیا گیا اور اسے انگریز کی بدیشی حکومت کی حکمت فرعونی کے شجرِ خبیث کا ثمر کہہ کر پکارا گیا۔ یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت کا اعتراف و اظہار تھا۔ اس لئے کہ جب تمام دنیا کے مسلمان، اختلافِ ممالک کے باوجود ایک قوم کے افراد ہیں تو ایک ملک کے مسلمان، صوبائی اختلاف سے کس طرح الگ الگ گروہوں میں بٹ سکتے ہیں۔

لیکن تشکیلِ پاکستان کے بعد جب مختلف صوبوں کے مسلمان ایک جگہ آکر آباد ہوئے تو ان میں صوبائی تعصب کے ایسے مظاہرے ہونے لگے جن پر دین و دانش، دونوں آنسو بہاتی ہیں۔ یہ تعصب ایسا شدید نظر آتا تھا کہ اس کے متصورہ نتائج، حساس قلوب میں تشویش انگیز خطرات پیدا کر رہے تھے۔ چنانچہ قائدِ اعظم مرحوم نے اس خطرہ کو اپنی خصوصی توجہ کا مستحق سمجھا اور ہر موقعہ اور ہر تقریب پر اس کی مخالفت کی۔ پریس، اسٹیج، نجی ملاقات، غیر رسمی تقاریب، ہر گوشہ سے اس کے خلاف آواز بلند کی گئی۔

لیکن اس کے بعد خود حکومتِ پاکستان نے کیا کیا؟ اس نے سال گزشتہ فیصلہ کر دیا کہ مرکزی حکومتوں کی ملازمتوں میں مشرقی اور مغربی پاکستان کی نیابت الگ الگ ہو اور تمام اسامیاں دونوں خطوں کے مسلمانوں میں نصف نصف بانٹ دی جائیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ صوبائی تقسیم کا وہ شجرِ ملعونہ جسے انگریز کی حکمتِ فرعونی کا ابلیسی کارنامہ کہا جاتا تھا، کس طرح خود اپنے ہاتھوں، اپنے صحنِ گلستاں میں پیوست کر دیا گیا اور اس کی آبیاری کیسے ذمہ دار ہاتھوں سے ہوئی۔

یہ تو تھی مشرقی اور مغربی پاکستان کی تقسیم۔ اب آگے بڑھئے۔ حال ہی میں حکومت کے شائع کردہ ایک منشور میں کہا گیا ہے کہ مغربی پاکستان کے حصہ کی اسامیاں، پنجاب، سرحد، سندھ، کراچی، بلوچستان، قبائلی علاقوں میں الگ الگ تقسیم کی جائیں گی۔ لیجئے! یہ وہ تقسیم ہے جو انگریز کے ملعون عہد میں بھی کبھی نہ ہوئی تھی۔

غور کیجئے۔ ایک طرف زبان سے یہ کہا جاتا ہے کہ صوبائی امتیاز ایک خبیث لعنت اور مستقبل میں تشویش انگیز نتائج کا پیش خیمہ ہے اور دوسری طرف اس تعصب کی جڑیں ایسی مضبوط کی جا رہی ہیں کہ جو کسی کے اکھیڑے نہ اکھڑ سکیں۔ معاشرتی زندگی میں صوبائی تعصب طنز و تشنیع سے آگے نہیں بڑھا کرتا۔ لیکن جب آپ صوبائی حدود کے ساتھ مستقل مفاد وابستہ کر دیں تو یہ وہ ہڈی ہوتی ہے جس پر انسان کتوں کی طرح لڑتے ہیں۔

ہندوستان میں آپ نے ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے الگ نیابت حاصل کی تو اس کی بنیاد جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ تھی کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ پاکستان میں، مختلف صوبوں کے مسلمانوں کے لئے جداگانہ نیابت کس ملی اصول کے تابع عمل میں لائی گئی ہے؟ کہا جائے گا کہ چونکہ بعض علاقے تعلیم میں پیچھے ہیں اس لئے انہیں خصوصی مراعات کی ضرورت ہے۔ یہ وہ دلیل ہے جو ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے مخصوص آسامیوں کی تائید میں دی جاتی تھی۔ لیکن آپ نے اس پر بھی غور کیا کہ یہی دلیل جو وہاں اسی محکم تھی یہاں کے حالات کے ماتحت کس قدر لچر ہے۔ وہاں تعلیم کا انتظام اس مشنری کے سپرد تھا جس میں اکثریت ہندوؤں کی تھی اس لئے وہ پس ماندہ مسلمانوں کی تعلیمی کمی کو پورا کرنے کے مواقع ہی نہیں دیتے تھے۔ لیکن یہاں تو تمام پاکستان کی تعلیم خود اپنے ہاتھ میں ہے اس لئے جن علاقوں میں تعلیم کی کمی ہے اس کمی کو پورا کرنے میں کونسا امر مانع ہے؟ کہہ دیا جائے گا کہ جب یہ کمی پوری ہو جائے گی تو یہ مخصوص نیابت بھی ختم کر دی جائے گی۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس دوران میں بھی اس تخصیص کے لئے کونسی ضرورت یا وجۂ جواز ہے؟ ہندوستان میں اس کی ضرورت یوں تھی کہ ہندو حکومت کے تمام شعبوں پر چھائے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھوں مسلمانوں کے گلے بُری طرح سے کٹتے تھے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ ملازمتوں میں مسلمانوں کا جداگانہ تناسب قائم رکھا جائے لیکن کیا یہاں بھی یہی خطرہ لاحق ہے؟ کیا یہاں بھی یہی صورت ہے کہ اگر ملازمتوں پر کسی خاص خطے کے مسلمان چھا گئے تو ان کے ہاتھوں دوسرے خطے کے مسلمانوں کے گلے کٹ جائیں گے۔ اگر یہ خطرہ واقعی ہے اور آپ کا قومی کیرکٹر ایسا ہی گرا ہوا ہے تو اس حقیقت کا اعتراف کیجئے کہ آپ کی قوم میں حکومت کی صلاحیت قطعاً نہیں ہے اور جس قوم میں حکومت کی صلاحیت نہیں ہوتی، حکومت کبھی ان کے پاس رہا نہیں کرتی۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے جو نہ کسی اور کی خاطر بدلا ہے اور نہ آپ کی خاطر بدلے گا۔ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔

آپ کو معلوم ہے کہ مخصوص نیابت کے نتائج و اثرات کیا ہوا کرتے ہیں۔ سب سے زیادہ مہلک اثر تو وہ جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔ یعنی یہ تخصیصی نیابت مختلف خطوں کے مسلمانوں کے تصادمِ مفاد کا ایسا مستقل ذریعہ بن جائے گی جس سے باہمی تفریق مستقل گروہ بندیاں پیدا کر دے گی اور اس کے بعد ساری دنیا کو ایک قوم قرار دینے کے مدعی (پاکستانی مسلمان) خود بھی ایک قوم نہ بن سکیں گے۔

اس کے بعد دوسرا مہلک نتیجہ یہ ہوگا کہ نیابتی تخصیص کی بنا پر چُنے ہوئے گروہ اسامیوں کے لئے بہترین قابلیت کے امیدواروں کو چھوڑ کر، کم قابلیت والوں کو لینا پڑے گا۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ آپ کے ہاں ایک تو پہلے ہی قابل افراد کی کمی ہے اور اگر ان میں سے بھی حقیقی جوہریوں چھٹ گئے تو پھر ملک کے نظم و نسق کا خدا حافظ!

پھر یہ بھی دیکھئے کہ جب کسی گروہ کو معلوم ہو کہ اس کے لئے مخصوص اسامیاں الگ رکھی ہیں تو اس کے مقابلہ کے جوہر آہستہ آہستہ مفقود ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں آگے وہی بڑھ سکتا ہے جو دوسروں سے مقابلہ اور مسابقت کے لئے ہر وقت تیار رہے۔ بقاء للاصلح فطرت کا قانون ہے اور جو اصلح نہیں اس کا شمار زندوں میں نہیں ہو سکتا۔ مخصوص اسامیاں درحقیقت بھیک کے ٹکڑے ہوتی ہیں۔ اور جس طرح گداگروں میں رفتہ رفتہ کام کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بلا مقابلہ مخصوص اسامیاں پا لینے والوں میں جوہر قابلیت مٹ جاتے ہیں۔

لہٰذا جن لوگوں کو آپ پچھلی صفوں سے نکال کر اگلی صفوں میں لانے کے لئے اسامیاں مخصوص کرتے ہیں، انہیں فی الحقیقت آپ ہمیشہ کے لئے پچھلی صفوں میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تصریحات بالا سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ حکومت کا یہ فیصلہ کہ مختلف صوبوں کے لئے ملازمتوں میں تناسب نمائندگی مخصوص کر دیا جائے، کس قدر مہلک نتائج کا آئینہ بردار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے فیصلوں کا ذمہ دار وہ غلط اصول ہے جس کے مطابق ہماری موجودہ حکومت کی کابینہ متشکل ہوئی ہے۔

یعنی وہ اصول جس کے مطابق، ارباب کابینہ کے انتخاب میں یہ امر ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ اس میں فلاں صوبہ کی نمائندگی کتنی ہے۔ خواہ اس سارے صوبہ میں ایک آدمی بھی اس قابل نہ ہو کہ وہ جوہر ذاتی کی بنا پر رکن کابینہ بن سکے۔ جب کابینہ کی تکوین اس غلط اصول کے مطابق ہوئی ہے تو پھر یہی غلط اصول آگے بھی چلتا ہے۔ یاد رکھئے۔ ہماری محکم اور پائندہ حکومت اسی صورت میں قائم ہو سکے گی جب ہم ان صوبائی تصوّرات سے بلند ہو کر صرف اسلامی نسبت کو پیش نظر رکھیں اور کسی کو کبھی خیال تک بھی نہ گزرے کہ فلاں شعبہ میں ہمارے صوبہ کی نمائندگی کس قدر ہے۔ صوبوں کی لکیریں، محض نظم و نسق کی سہولت کی خاطر کھینچی گئی تھیں، نہ کہ ملک کے باشندوں میں تفریق پیدا کرنے کے لئے۔ اگر یہ لکیریں اس قسم کی تفریق کے خطوط بن رہی ہیں تو، ان لکیروں کو جس قدر جلد مٹایا جا سکے اتنا ہی اچھا ہے۔ تاکہ

ایک ہوں سارے حرم کی پاسبانی کے لئے

— ۲ —

"آج کا بچہ کل کی قوم ہوتا ہے"۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو اپنی صداقت کے لئے کسی خارجی دلیل و برہان کا محتاج نہیں۔ ہر قوم کا مستقبل اس کے بچوں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ یہ ننھے ننھے جگنو، ملت کے مقدر کے تابناک ستارے ہوتے ہیں۔ اس لئے زندہ قومیں خود مصیبتیں برداشت کرتی ہیں، لیکن اپنے بچوں کی نگہداشت میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتیں۔ وہ جس قدر اہتمام ان کی پرورش اور تربیت کا کرتی ہیں، خود اپنے لئے اتنا کچھ نہیں کرتیں۔ اور بات ہے بھی یہی۔ اگر مکان کی بنیادیں مضبوط ہوں تو وہ ہر زلزلہ کا جھٹکا برداشت کر سکتا ہے۔ اس لئے اگر بچپن کے زمانہ میں صحت کا صحیح صحیح خیال رکھا جائے تو بڑے ہو کر زیادہ کاوش کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ یورپ کی اقوام کو دیکھئے بچوں کی پرورش کا کس قدر خیال رکھا جاتا ہے۔ وہاں پیدائش سے قبل جنین کے تولّی کا خیال رکھنا شروع کر دیا جاتا ہے۔ پھر پیدائش کے بعد، ملک کی بہترین غذائی اشیا بچوں کے حصہ میں آتی ہیں۔ بہترین پرورش گاہوں میں، قابل ترین افراد کی زیر نگرانی، ان کی پرورش ہوتی ہے۔ اسکولوں میں ماہرین ڈاکٹر ان کی جسمانی حالت کا معائنہ کرتے رہتے ہیں۔ غرضیکہ پوری کی پوری قوم، اپنی توجہات کا بہترین حصہ، اس متاع گراں بہا کی حفاظت اور پرورش میں صرف کرتی ہے۔ خطرہ کی حالت میں، سب سے پہلے انہیں حفاظت کے مقام میں پہنچایا جاتا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ گزشتہ جنگ عالمگیر میں جب انگلستان کو اپنی تباہی کا خطرہ ہوا ہے تو انہوں نے بچوں کو فوراً آسٹریلیا کی طرف منتقل کر دیا تھا جہاں ان کی صحت اور پرورش کے بہترین سامان فراہم کئے گئے تھے۔

یہ تو ہے زندہ قوموں کی کیفیت۔ لیکن ہمارے ہاں بچے ایک ایسی جنس کاسد ہیں جن کی حفاظت کی کوئی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔ امرا کے طبقہ میں، جو ہماری آبادی کا قلیل ترین حصہ ہیں، بچوں کی پرورش

وتربیت کا سلیقہ نہ ہونے کی وجہ سے، روپیہ صرف کرنے کے باوجود ان کے بچوں کو دیکھئے تو

کاٹو تو لہو نہیں بدن میں

مریل سے زرد، زرد، پتلے دُبلے۔ ہر وقت مریض۔ دوائیوں کے سہارے جینے والے۔

متوسط درجہ کا طبقہ، جو درحقیقت ہمارے ہاں صرف نام کے لئے ہے ورنہ ان کی حالت غریبوں سے بھی بدتر ہے۔ ان کی کیفیت یہ کہ ہزار چاہتے ہیں کہ ان کے بچوں کی پرورش اچھے طریقہ پر ہو لیکن اس کے لئے ان بچاروں میں استطاعت ہی نہیں ہوتی۔ وہ ان بچوں کو بمشکل "سفید پوش" رکھ سکتے ہیں۔

باقی رہے غریب۔ سو ان کے بچے تو اسی طرح پرورش پا جاتے ہیں جس طرح عام حیوانات کے بچے۔ بلکہ ان سے بھی بدتر حالت میں۔ ان بچاروں کے لئے نہ رہنے کو گھر۔ نہ کھانے کو روٹی۔ نہ پہننے کو کپڑا۔ غلیظ ترین ماحول۔ بدترین خوراک۔ صحت مند ہیں تو پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ بیمار ہیں تو دوائی نہیں۔ ان کا زندہ رہ جانا محض از قبیل اتفاقات ہوتا ہے۔

لیکن امیر ہوں یا غریب، بچوں کی صحیح پرورش کا انتظام انفرادی طور پر ہو ہی نہیں سکتا۔ جس کے لئے ہمیشہ اجتماعی انتظام کی ضرورت ہوتی ہے اور حکومت کے اولین فرائض میں داخل۔ لیکن یہاں یہ حالت ہے کہ حکومت کو گویا احساس تک بھی نہیں کہ یہ بھی کوئی کرنے کا کام ہے۔ مثلاً سلطنت کے مرکزی مقام (کراچی) کو دیکھئے۔ کسی حکومت کے دارالخلافہ کے انتخاب کے وقت جن بنیادی امور کو پیش نظر رکھا جاتا ہے ان میں اس کا صحت افزا ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ لیکن کراچی کا یہ عالم ہے کہ مغربی پاکستان میں صحت کے لحاظ سے بدترین مقام ہے۔ اس قسم کی مرطوب آب و ہوا کبھی ممد صحت نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ اس کی رطوبت کے ازالہ یا مدافعہ کے لئے مستقل طور پر ایسی غذاؤں کا استعمال نہ کیا جائے جن میں حرارت غریزی کے بڑھانے کی صلاحیت ہو۔ اور اس قسم کی غذائیں اتنی گراں قیمت ہوتی ہیں کہ عام لوگ ان کی استطاعت ہی نہیں رکھتے۔ مغربی پاکستان کے شمال مغربی علاقوں میں جا کر دیکھئے۔ غریبوں اور بھکاریوں تک کے بچے، محض آب و ہوا کے زور پر صحت اور مسرت کے لپٹتے ہوئے چشمے دکھائی دیں گے۔ ان کے جسم میں ایسا خون صالح موجیں مار رہا ہوگا کہ یہاں آپ کے وزراء تک کے بچوں کے تصور میں بھی نہ آسکے۔ یہ وہ نعمت ہے جو قدرت کی طرف سے بالکل مفت ملتی ہے لیکن اس سے قلب حکومت (یعنی دارالخلافہ) یکسر محروم ہے۔ دارالخلافہ کو ہم نے قلب سلطنت اس لئے کہا ہے کہ مملکت کے بہترین افراد دارالخلافہ ہی میں جمع ہوتے ہیں اور یہیں سے تمام سلطنت کو زندگی کی حرارتیں تقسیم ہوتی ہیں۔ جس سلطنت کا دارالخلافہ کسی جہت سے کمزور ہو وہ تمام سلطنت اس شعبہ میں کمزور رہ جاتی ہے۔

انتخاب مقام کے بعد خوراک کی طرف آئیے۔ دودھ، گھی، گوشت، انڈا، سبزی، پھل، آٹا، چاول،

یہی عناصر ہیں جن کا نام غذا ہے۔ اول تو ان میں سے کوئی چیز بھی کراچی میں پیدا نہیں ہوتی، سب کچھ باہر سے آتا ہے (بجز مچھلی کے)۔ باہر سے لائی ہوئی اشیا ایک تو نسبتاً گراں ہوتی ہیں اور دوسرے وہ تازہ حالات میں نہیں مل سکتیں۔ کراچی میں گرانی کا یہ عالم ہے کہ سوائے امیر طبقہ کے، دودھ، گھی، پھل وغیرہ، عام لوگوں کے نصیب میں ہی نہیں ہو سکتے۔ پھر، جو لوگ ان چیزوں کے خریدنے کی استطاعت رکھتے ہیں وہ بھی ہزار جتن کریں، کوئی چیز یقینی طور پر خالص نہیں مل سکتی۔ چھ روپے سیر تک کا گھی خریدیئے۔ کچھ معلوم نہیں کہ آپ کیا کھا رہے ہیں؟ جو جی میں آئے کر لیجئے، خالص دودھ آپ کو کسی قیمت پر بھی نہیں مل سکتا۔ کریم (بالائی) پہلے الگ کر لی جاتی ہے اور پھر اس میں نہ معلوم کہاں کہاں کے جوہڑوں کا غلیظ پانی ملایا جاتا ہے۔ اس مرکب کا نام ہوتا ہے دودھ۔ گوشت کے جانور کہیں باہر سے آتے ہیں۔ اس لئے ایسے دبلے پتلے اور مریض ہوتے ہیں کہ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ کس جانور کا گوشت کھا رہے ہیں۔ انڈے کے متعلق کبھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مرغی ہی کا ہے۔ سبزیاں باسی اور گراں قیمت ہوتی ہیں۔ آٹا راشن میں ملتا ہے۔ لیکن خدا جانے اس میں کیا کچھ ملایا جاتا ہے کہ انتڑیاں بچاری چیخ اٹھتی ہیں۔ جسے دیکھو پیٹ پکڑے پھر رہا ہے۔

شہر میں صفائی کا یہ عالم ہے کہ وہی کراچی جو کبھی اس باب میں مثالی شہر کہا جاتا تھا۔ اب غلاظت اور کثافت کا بدترین نمونہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ امراء اور حکام کے رہنے کے علاقے (جنہیں عرف عام میں سول لائنز کہا جاتا ہے) صفائی کا اچھا نمونہ پیش کرتے ہیں، لیکن ان چیزوں کا معیار و مقیاس تو عمومی حالت ہوتی ہے نہ کہ خاص خاص علاقے۔ صفائی کے اعتبار سے شہر کی عمومی حالت دیکھنی ہو تو اندرون شہر جائیے اور پھر دیکھئے کہ وہ علاقے، ہمارے بالائی طبقے کے دلوں سے بھی زیادہ گندے ہیں یا نہیں۔ اور تو اور، بیشتر علاقے ایسے ہیں، جہاں پینے کا پانی تک میسر نہیں آتا۔

جب صفائی کا یہ عالم ہو تو ظاہر ہے کہ تفریح گاہوں کی کیفیت اس سے بھی بدتر ہوگی۔ یہاں سے جانے والوں نے اپنی محدود آبادی کی ضروریات کے مطابق، دو تین چھوٹے چھوٹے پارک بنوائے تھے، بس یہی یہاں کی تفریح گاہیں ہیں۔ بچوں کی پرورش گاہوں کا ہمارے ہاں رواج ہی نہیں۔ باقی رہے اسکول، سو اول تو ان کی تعداد اس قدر کم ہے کہ بیشتر بچے داخلے ہی سے محروم رہ جاتے ہیں، اور جو صاحب نصیب بچے داخل ہو جاتے ہیں وہ گویا ڈربوں میں دھکیل دیئے جاتے ہیں۔ چند چھوٹے چھوٹے کمرے۔ ان میں "بلیک ہول" کی طرح ٹھنسے ہوئے بچے۔ غلیظ ماحول، کثیف فضا۔ نہ کھیل کا میدان۔ نہ تفریح کا مقام، نہ ڈاکٹروں کا تسلی بخش انتظام۔ نہ طبی امداد کا صحیح نظم و نسق۔ اسکولوں میں جا کر، ملت کے مقدر کے ان "ستاروں" کو دیکھئے۔ بجھے ہوئے انگارے دکھائی دیں گے۔ نہ کسی کے جسم میں خون ہے نہ آنکھوں میں چمک۔ نہ چہرے پر بشاشت

نہ روح میں شگفتگی۔ ہڈیوں کے ڈھانچے جنہیں، سلے ہوئے کفن تنے ڈھانپ رکھا ہے۔ انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یا اللہ! اور ذمہ داریاں تو ایک طرف، یہ بچے خود اپنی زندگی کی گاڑی کو پچاس، ساٹھ برس تک کیسے کھینچیں گے۔ (ہم اس وقت تربیت اور تعلیم کے رستے ہوئے ناسور کو نہیں چھیڑنا چاہتے، صرف جسمانی صحت کی حالت تک ہی اپنے آپ کو محدود رکھنا چاہتے ہیں)۔

یہ ہے ان بچوں کی حالت کا ایک سرسری سا جائزہ جنہوں نے دس پندرہ برس کے بعد پاکستان کی قوم بننا ہے۔ جس باغ کے پودوں کی یہ حالت ہو اس کے پیڑوں کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ قرآن نے، فرعون کے خلاف جو فرد جرم مرتب کی ہے اس میں ذبح ابناء (بچوں کے قتل) کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ویسے بھی اس نے عام مجرمین کے متعلق بڑی وضاحت سے کہا ہے کہ وہ "یھلك الحرث والنسل" (سامان معیشت اور نسل انسانی کی ہلاکت) کا موجب بنتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ جو قوم اپنے بچوں کی حفاظت و پرورش سے یوں غافل ہو جائے وہ "ذبح ابناء" اور ہلاکت نسل کے سنگین جرموں کی مرتکب ہوتی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ "فطرت، افراد سے تو اغماض کر لیتی ہے لیکن قوموں کے اجتماعی جرائم سے چشم پوشی نہیں کیا کرتی" (ان جرائم کا فطری نتیجہ جسے مشیت کا قانون مجازات کہا جاتا ہے)۔ پوری کی پوری قوم کی تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔

ہم نے طلوع اسلام کی کسی سابقہ اشاعت میں جب تعلیم کے مسئلہ پر چند الفاظ لکھے تھے تو اس وقت یہ کہا تھا کہ آپ یہ کہہ کر اپنے آپ کو بری الذمہ نہ قرار دے لیں کہ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے، ہم اس بات میں کیا کر سکتے ہیں۔ ہم نے کہا تھا کہ اس انقلاب سے پہلے جس طرح آپ اس قسم کے مسائل کے متعلق کچھ سوچا کرتے تھے، اسی طرح اب بھی ان پر غور و فکر کیجئے۔ اگر ارباب حکومت ان مسائل میں اپنی ذمہ داری کا احساس نہ کریں گے تو کیا آپ اپنی آنے والی نسلوں کو اس طرح خاموشی سے ہلاک ہونے دیں گے! ہم قوم کے ارباب فکر و نظر سے درخواست کریں گے (بشرطیکہ اس قسم کے افراد، قوم میں موجود ہیں) کہ وہ ان مسائل کو حکومت کے سپرد کر کے مطمئن نہ ہو جائیں۔ خود مل کر بیٹھیں اور سوچیں کہ ان کا حل کیا ہے۔ اور اس کے بعد ایسی تدابیر اختیار کریں جن سے، حکومت کی مدد کے ساتھ یا عند الضرورت اس کے بغیر ہی، آپ کی سوچ بچار کے نتائج، عملی شکل اختیار کر لیں۔

عید الضحیٰ

محترم پرویز صاحبؒ کی ایک تقریر

مذہب کے متعلق عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ وہ ایک فرد کی ذاتی اصلاح کا ذریعہ ہے اس میں شبہ نہیں کہ افراد کی ذاتی اصلاح نہایت ضروری ہے۔ لیکن یہ اصلاح اصل مقصد نہیں۔ عمدہ گھڑی کے ہر پرزہ کے لئے مضبوط اور درست ہونا ضروری ہے۔ لیکن اگر یہ پرزے الگ تھلگ پڑے ہوں۔ تو ان کی پائیداری اور مضبوطی کسی کام کی نہیں۔ یہی پرزے جب ایک نظام کے ماتحت۔ ایک خاص ترتیب سے۔ ایک جگہ جمع کر دئے جائیں تو ان میں سے ہر پرزہ کی حرکت، دوسرے پرزوں پر اثر انداز ہوگی اور اس طرح ان کی اس مجموعی حرکت کا جیتا جاگتا نتیجہ۔ محسوس شکل میں۔ گھڑی کے ڈائل پر نمودار ہو جائے گا۔ اسلام افراد کی اصلاح سے ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے جو نظامِ انسانیت کو عدل پر چلا سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے ایک ایسا عملی پروگرام مرتب کر دیا ہے جس میں ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھتا ہے۔ نماز کے لئے پانچ وقت کا اجتماع۔ تقویٰ۔ ضبطِ نفس۔ غیر اللہ کی محکومی سے انکار۔ اللہ کی حاکمیت کا اقرار مرکزیت۔ اجتماعیت۔ اطاعتِ امام کا عملی مظاہرہ ہے۔ جمعہ کے اجتماع میں یہ دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ عید کی تقریب پر اس کی حدود اور زیادہ پھیل جاتی ہیں۔ اور بالآخر حج کے میدان میں اس کی وسعتیں ساری دنیا کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہیں۔ رمضان المبارک کے پورے مہینے کی مشق و ریاضت کے بعد جب ذہنوں میں جلا۔ دلوں میں تازگیِ ایمان نگاہوں میں مومنانہ فراست اور خون میں مجاہدانہ حرارت پیدا ہو گئی تو عید الفطر کے اجتماع میں ہر مقام سے ملتِ اسلامیہ کی نمائندگی کیلئے بہترین افراد کا انتخاب ہوا۔ مسلم نمائندوں کے یہ قافلے دنیا کے دور دراز گوشوں

سے جنگل۔ بیاباں کوہ اور دریا کے مرحلوں کو طے کرتے ہوئے۔ جن کُل پنچ تحقیق اپنی بین الملی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے چاروں طرف سے ایک مرکز کی طرف کھنچے چلے آرہے ہیں۔ دنیا میں کوئی جماعت بلامرکز قائم نہیں رہ سکتی۔ مسلمانوں کے فکر و نظر کا مرکز قرآن۔ اطاعت کا مرکز امیر۔ اور اجتماعیت کا مرکز وہ بیت الحرام ہے جو ایک خدا کے ماننے والوں کے مورث اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقدس ہاتھوں سے وجود میں آیا۔ اور دنیا کے بتکدہ میں خدا کا پہلا گھر کہلایا۔ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ (۳:۹۶)

بلاشبہ پہلا گھر جو تمام انسانوں کے لئے (بطور مرکز) بنایا گیا ہے وہ یہی ہے جو مکہ میں ہے۔ برکت والا اور تمام دنیا کے لئے ہدایت کا سرچشمہ۔ وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا۔ جو کوئی اس کے حدود میں داخل ہوا وہ امن اور حفاظت میں آگیا۔

اسلام دنیا میں جس نظام کو قائم کرنے کے لئے آیا ہے اس کی بنا اس اصول پر ہے کہ تمام انسان ایک برادری کے فرد ہیں وہ ان تمام غیر فطری حد بندیوں کو توڑنے کے لئے آیا ہے۔ جن سے انسانوں کی یہ برادری مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ نسل کا امتیاز۔ رنگ اور زبان کا امتیاز۔ جغرافیائی حدود کا امتیاز اس کے نزدیک سب غیر فطری حد بندیاں ہیں۔ اس لئے خدا کے اس گھر میں جب انسان جمع ہوں گے تو باطل کے ان امتیازات میں سے کوئی امتیاز باقی نہیں رہے گا۔ چینی۔ جاپانی۔ ہندی۔ افغانی۔ ایرانی۔ تورانی۔ ترکی۔ حبشی افرنگی سب ایک ملت کی شکل میں اس عظیم الشان حقیقت کا اعلان کرنے کے لئے جمع ہوں گے کہ

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

یہی نہیں بلکہ مختلف قسم کے لباسوں سے جو اعلیٰ اور ادنیٰ کے امتیاز کی جھلک نمودار ہو سکتی ہے اسلام نے اسے بھی روا نہیں رکھا اور حکم دیدیا کہ ارضِ حرم میں داخل ہونے سے پہلے سب ایک ایک ان سلی چادر میں لپٹے ہوئے حاضر ہوں۔ تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری۔ یہ ہے وہ وردی جو اس بین الملی کانفرنس میں شرکت کرنے

والوں کے لئے تجویز کی گئی ہے۔ یوں باطل کے ہر استبداد کو مٹاتے۔ وحدت کے رنگ میں رنگے یہ قافلے چاروں طرف سے، اپنے مرکز کی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ سب ایک آقا کے غلام ایک حاکم کے محکوم۔ ایک قانون کے تابع۔ ایک نظام کے پابند۔ فقیرانہ لباس۔ ننگے سر گدایانہ وضع۔ قلندرانہ ادائیں، سکندرانہ جلال۔ دنیا بھر کے آستانوں سے بے نیاز، ستارہ وار گذرتے ہوئے ایک ہی چوکھٹ پر سر جھکانے کے لئے بیتاب۔ دل وفور شوق سے بیقرار، آنکھیں عہد تجدید سے نشہ بار لبیک اللّٰھم لبیک کہتے ہوئے یوں رواں دواں۔ جانب مرکز کھنچے چلے آ رہے ہیں جیسے شہد کی مکھیاں، رنگ و بو کی فضاؤں کے جوہر اپنے سینوں میں بھر کر سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے شام کے وقت اپنے چھتے کی طرف پروانہ وار اڑتی چلی آ رہی ہوں کہ اپنی محنتوں کا سرمایہ، تگ و دو کا ماحصل۔ مرکز میں لا کر اکٹھا کر دیا جائے۔

زمانہ ابراہیمی میں رواج تھا کہ عہد و پیمان کی پختگی کے لئے ایک پتھر پر ہاتھ مارتے تھے۔ جب ان رہروان منزل شوق کے قافلے۔ حریم کعبہ میں پہنچے تو اس عہد و پیمان کی تجدید کے لئے جو انہوں نے اپنے اللہ سے باندھ رکھا ہے۔ حجر اسود کو چھوا۔ بعض نے ہجوم کی وجہ سے دور ہی سے اشارہ کر دیا۔ کسی نے پیمان کے تقدس کی رعایت سے ہاتھ کو چوم لیا اور یوں اس عہد کی تجدید ہو گئی کہ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ۔

میری نماز، میرا حج، میرا جینا، میرا مرنا سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام کائنات کا پروردگار ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں خدا کے فرمانبرداروں میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں۔

اس عہد و پیمان کی تجدید سے، وجد و مسرت اور سرمستی و شیفتگی کی وہ کیفیت طاری ہوئی کہ والہانہ انداز میں خدا کے اس گھر کے گرد۔ پروانہ وار گھوم رہے ہیں۔ کوئی کعبہ کی چوکھٹ پر سر رکھے محو نیاز ہے۔ کوئی اس کا غلاف تھامے عالم وارفتگی میں جھولی پھیلائے کھڑا ہے۔ دل

ہیں مقدس آرزؤں کا ہجوم۔ آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو۔ لب پر دعائیں۔ محویت کا عالم۔ آسمان سے نور کی بارش۔ رحمتوں کا نزول۔ غرضیکہ ایک نئی دنیا اور ایک عجیب سماں ہے۔

تمام حجاز کے متوالوں کے یہ قافلے ۹ تاریخ کو عرفات کے میدان کی طرف روانہ ہو گئے پاک اور صاف، سر سے پاؤں تک للّٰہیت میں ڈوبے ہوئے۔ قدم وادیٔ مکہ میں، نگاہیں عرش معلیٰ پر، کوئی تیز گام کوئی آہستہ خرام۔ کشاں کشاں ۹ تاریخ کو اس میدان میں آ جمع ہوئے۔ کیسا حسین نظارہ ہے۔ سب ایک آقا کے غلام۔ ایک ملت کے فرد۔ ایک ہی وضع۔ ایک ہی انداز۔ بھائی سے بھائی ملا۔ ایک کا دوسرے سے تعارف ہوا کہ اس مقام کا نام ہی **عرفات** کا میدان ہے، اجتماع کیا ہے؟ مساوات اور محبت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر ہے جس میں ہر قطرہ، اپنے آپ کو خود سمندر محسوس کرتا ہے۔ یہ سب خدا کے حضور جمع ہوئے ان کا منتخب **امام** منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آیا۔ اس نے ملت کی اجتماعی حالت پر تبصرہ کیا۔ اور سال بھر کے لئے ایک مرتب شدہ پروگرام کا اعلان کر دیا جس کی تکمیل کے لئے دعائیں مانگی گئیں التجائیں کی گئیں اور یوں یہ عظیم الشان اجتماع زندہ آرزؤں کی ایک نئی دنیا اپنے جلو میں لئے۔ دوسری صبح منیٰ کے میدان میں آ گیا۔ یہی وہ میدان ہے جہاں ملت حنیفہ کے پیشوائے اعظم، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنے کے لئے پیشانی کے بل لٹا دیا تھا۔ اور یوں اپنے ایمان محکم کا عملی ثبوت دیا تھا کہ تیرا حکم ہو تو عزیز ترین متاع بھی بلا تامل نثار کر دی جا سکتی ہے۔ اس عظیم قربان گاہ میں پہنچ کر ملت اسلامیہ کے ان نمائندوں نے اس اقرار کو دہرایا کہ تیرا نام بلند کرنے کے لئے جو پروگرام مرتب ہوا ہے اس کی تکمیل میں جس قربانی کی ضرورت ہو گی۔ بلا دریغ کر دی جائے گی۔ یہاں پہنچ کر مختلف ملکوں کے نمائندوں نے اپنے اپنے خیمے لگائے۔ یہ سب اللہ کے مہمان ہیں اس لئے خود ہی مہمان اور خود ہی میزبان ہیں آج صبح ہندی مسلمانوں کے ان سب کے کھانے کا انتظام ہے شام کو ایرانیوں کا اہتمام ہے۔ ان دعوتوں کے لئے قربانیاں کی جا رہی ہیں مسافروں کو کھانے پینے ہی کا ہے لیکن چونکہ وہ مقصد عظیم جس کے لئے یہ اجتماع ہوا ہے خالصتاً اللہ کے لئے ہے اس لئے یہ دعوتیں بھی

دنیا کی دعوتوں سے نرالی ہیں۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۭ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ۭ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ (۲۲/۳۷) اللہ تک ان قربانیوں کا گوشت اور خون نہیں پہونچتا۔ بلکہ تمہارے دل کا تقویٰ۔ پاکیزگی مقصد پہونچتی ہے۔ اس نے ان جانوروں کو اس طرح تمہارے لئے مسخر کر دیا کہ تم اللہ کی راہنمائی پر اس کے نام کو بلند کرو۔ اور نیک کرداروں کے لئے بشارت ہے۔ دعوتیں اور ضیافتیں ہیں۔ ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملک والوں کو اپنے مقامی حالات سے آگاہ کر رہے ہیں، ذہنی اور قلبی تعارف ہو رہا ہے۔ ادہر ادہر مختلف ملکوں کی مصنوعات کی نمائش لگ رہی ہے۔ خرید و فروخت ہو رہی ہے۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ (۲/۱۹۸) اس میں کوئی حرج نہیں کہ تم (حج میں) اپنے رب کا فضل (یعنی معیشت) کماؤ۔ اس طرح یہ اجتماع ملت اسلامیہ کے لئے دینی اور دنیاوی سیاسی۔ اقتصادی۔ معاشی۔ معاشرتی فوائد کا ذریعہ بن رہا ہے کہ حج کا مقصد یہی ہے لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ تاکہ لوگ اپنے فوائد کے لئے حاضر ہوں

تین دن تک یہ اجتماع رہا جس میں عالم اسلامی کے ہر گوشے اور ملت اسلامیہ کے ہر شعبے کے متعلق باہمی تبادلۂ خیالات ہوا۔ اُدہر یہ ہو رہا ہے۔ اِدہر تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ملت کے افراد۔ اپنے اپنے ہاں وادیٔ مکہ کے اجتماع سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے عیدگاہوں میں جمع ہو رہے ہیں۔ ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے نیز اس پروگرام کو سننے کے لئے جس کا اعلان ایک دن پہلے میدان عرفات میں ہوا ہے۔ اس پروگرام کی اطلاعیں ریڈیو اور تار برقی سے تمام عالم اسلامی تک پہونچ چکی ہیں۔ مقامی مسلمان عیدگاہوں میں پہونچے۔ اپنے اپنے خطیبوں سے اس پروگرام کو سن لیا اور سمجھ لیا جس پر اب سال بھر عمل کیا جائے گا۔ وہ تھا حج یہ ہے عید۔ وہ فریضۂ مقدس جس میں نوع انسانی کے قیام و بقا کا راز ہے۔ تمام انسانوں کا اس لئے کہ مسلمان دنیا میں اپنے ہی لئے نہیں جیتا بلکہ اس کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ تمام دنیا کو اس نظام پر چلائے

جس سے انسانیت پڑھے۔ پھولے۔ پھلے۔ اور عروج و ارتقاء کی منزلیں طے کر کے۔ اس منزل سے اگلی منزل میں جا پہونچے۔ حج اس نظام کی سب سے اہم کڑی اور کعبہ اس نظام کا مرکز ہے۔ جَعَلَ اللّٰہُ الکعبۃ البیت الحرام قیاماً للناس (۵/۹۷)۔ اللہ نے کعبہ کو جو حرمت کا گھر ہے تمام انسانوں کے لئے امن و عافیت کے قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔ انسانوں نے مختلف خطوط پر مختلف قسم کی جمعیتیں بنا بنا اور بگاڑ بگاڑ کر مختلف تجربے حاصل کئے ہیں اور ہر تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ـــ تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی ـــ یہ سب اس لئے کہ جن اصولوں پر یہ جمعیتیں بنائی گئیں وہ سب غیر فطری تھے۔ فطرت کے مطابق تو ایک ہی اصول ہے اور وہ یہ کہ انسانوں کی تقسیم ملکوں اور قوموں کی رُو سے نہ کی جائے بلکہ تمام انسانوں کو ایک عالمگیر برادری تصور کر کے انہیں ایک مرکز کے ماتحت خدا کے قانون کے تابع رکھا جائے۔ یہی وہ عظیم الشان اصول ہے جس کی رُو سے مکہ کو ھدی للعالمین تمام دنیا کے لئے ہدایت کا سرچشمہ اور کعبہ کو قیاما للناس۔ تمام نوع انسانی کے قیام کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ اس جمعیت آدم کا فطری نتیجہ ہے دنیا کا امن و سکون۔ ومن دخلہ کان امناً جو اس میں داخل ہوا۔ امن و حفاظت میں آگیا حج اور عید اسی منزل کے نشانِ راہ ہیں۔

اسلام کا آخری رکن

(علامہ حافظ محمد اسلم جیراج پوری)

دین اسلام کے پانچ رکن تسلیم کئے گئے ہیں۔ پہلا رکن کلمۂ توحید ہے جس کے اوپر اسلام کی بنیاد ہے۔ کلمۂ توحید بمنزلہ اسلام کے دروازہ کے ہے۔ کوئی شخص دین اسلام میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا اور نہ مسلمان کہا جا سکتا ہے جب تک کہ اس کلمہ کو دل سے نہ مان لے اور اس کا اقرار نہ کرلے۔ اس لئے یہ سب سے پہلا اور اسلام کا اول رکن ہے دوسرا رکن نماز ہے جس کا ادا کرنا ہر بالغ عاقل مسلمان پر فرض ہے۔ اور جس سے انسان کی صحیح بندگی کا تعلق اپنے خالق اور مالک کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔

تیسرا رکن زکوٰۃ ہے جس کا ادا کرنا صرف ان مسلمانوں پر فرض ہے جو صاحب نصاب ہوں یعنی جن کے پاس بڑھتا ہوا مال شرع کی معیّن کی ہوئی مقدار سے کم نہ ہو اور اس پر سال گذر جائے۔

نماز اور زکوٰۃ مکہ ہی میں فرض ہو چکی تھیں۔ قرآن کی ان سورتوں میں جو مکی ہیں نماز اور زکوٰۃ دونوں کے احکام ہیں۔ بلکہ دونوں بیشتر ایک ساتھ ہی مذکور ہوئے ہیں لیکن مکی آیات میں زکوٰۃ کا جو ذکر آتا ہے۔ اس کی نوعیت اس زکوٰۃ سے جو مدنی آیات میں ہے یکسر مختلف ہے۔ مکہ میں اسلام کی کوئی اجتماعی طاقت پیدا نہ ہو سکی تھی اور نہ کسی قسم کی سیاسی حیثیت قائم ہو گئی تھی۔ اس لئے وہاں زکوٰۃ صرف رضاکارانہ صدقات و خیرات کا نام تھا بخلاف اس کے مدینہ میں جب اسلام کی اجتماعی زندگی شروع ہوئی اور حکومت الٰہیہ قائم ہو گئی تو اس کے اخراجات کے لئے ملت کے ارباب نصاب سے سالانہ زکوٰۃ وصول کی جانے لگی جس کے قواعد و ضوابط خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتب فرمائے تھے۔ اور وہ اجمالاً یہ تھے کہ ہر صاحب نصاب

مسلم سے سال کے خاتمہ پر قریب ڈھائی فیصد کے زکوٰۃ امام کی طرف سے وصول کی جاتی - اور جس کے پاس دو سو درہم سے کم یعنے موجودہ سکہ کے حساب سے چالیس روپیہ سے کم ہوں وہ صاحب نصاب نہیں ہے اس سے کچھ نہ لیا جائے - کم و بیش یہی نسبت یعنے ڈھائی فیصد کی مویشی وغیرہ کی زکوٰۃ میں بھی رکھی گئی - اس کے ساتھ اپنی مرضی سے خیرات و صدقات کا سلسلہ بھی جاری رہا جو انفرادی تھا اور جس کے لئے کسی مخصوص آئین و ضابطہ کی ضرورت نہ تھی

چوتھا رکن اسلام کا روزہ ہے جو سنہ ۲ ہجری میں مدینہ میں فرض کیا گیا - اور سب سے آخری رکن حج ہے جو سنہ ۸ ہجری میں مکہ فتح ہو جانے کے بعد فرض ہوا -

میرا خیال ہے کہ یہ آخری رکن اپنی اہمیت کے لحاظ سے اس قدر عظیم الشان ہے کہ بہت پہلے فرض کر دیا جاتا اگر مکہ مسلمانوں کے قبضہ میں ہوتا - بیت اللہ پر مشرکین کے تسلط کی وجہ سے اس کی فرضیت میں تاخیر بعید از قیاس نہیں - چنانچہ سنہ ۶ ہجری میں جب حضور اکرم کعبہ کے شوق دید میں بیتاب ہو کر مسلمانوں کو ساتھ لے کر عمرہ کے لئے تشریف لے گئے تو کفار مکہ نے اس چھوٹے حج سے بھی روک دیا - اور مکہ میں داخل نہیں ہونے دیا - اس لئے حج کی فرضیت اسی وقت ہوئی جب مسلمانوں کا تسلط مکہ پر ہو گیا - اور یہ تسلط سنہ ۸ ہجری میں ہوا -

قرآن کریم میں غور کرنے سے ہر صاحب بصیرت اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اسلام مجموعی لحاظ سے اجتماعی دین ہے یعنی وہ تمام بنی نوع انسان کی اجتماعی زندگی کا ایک مکمل نظام ہے - بیشک وہ انفرادی تعلیمات بھی پوری پوری اپنے اندر رکھتا ہے - لیکن ان تعلیمات سے وہ افراد کا تزکیۂ نفس اور ان میں تقوےٰ و طہارت پیدا کر کے ان کو ملت کا جزو صالح بنانا چاہتا ہے تاکہ پوری ملت کی زندگی ایک نجات یافتہ زندگی ہو جائے - یہاں ضمناً اس امر کی طرف اشارہ کر دینا بے موقع نہ ہوگا کہ اسلام کی اجتماعی زندگی جو خلافت راشدہ یعنے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی زندگی تک قرآن کے مطابق تھی - بنی امیہ کی ملوکیت قائم ہو جانے کے بعد سے بالکل بدل گئی - نہ صرف اس لئے کہ یہ ملوکیت بجائے حکومت الٰہیہ کے انسانی حکومت تھی جو اسلام کے بالکل منافی تھی بلکہ اس لئے

بھی نہ ان نام نہاد خلفاء نے، جو سوائے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے جن کا کل زمانہ دو سال تھا سب کے سب دراصل مستبد بادشاہ تھے اپنی فوج خود لئے اور ملک پر اپنا قبضہ جما کر دین کو افراد کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا۔ جس کی وجہ سے اس کا اجتماعی نظام ٹوٹ گیا اور کوئی مرکز اس کی قیادت کے لئے نہیں رہا۔ چنانچہ افراد کی دینی رہنمائی کرنے والوں میں آپس میں اختلافات شروع ہوگئے تو ان تنازعوں اور جھگڑوں کو فیصلہ کرنے والی کوئی قوت نہ تھی جو ان کو چکا کر مسلمانوں کو افتراق اور تشتت سے بچا لیتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دین کے لحاظ سے ملت میں نئے فرقے پیدا ہونے لگے اور اس کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی جس کی شیرازہ بندی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ملت میں پھر نبوت اور خلافت راشدہ کے منہاج پر مرکزیت نہ قائم ہو۔

آخر رفتہ رفتہ ہوا یہ کہ سوائے وابستگان سلطنت کے جملہ اہل اسلام ملی مشاغل سے نہ صرف فارغ بلکہ غافل ہوتے گئے۔ ان میں سے جن کو دین کا زیادہ ذوق ہوتا وہ ظاہری مہمات ملت کے دروازے اپنے اوپر بند پاکر باطنی تزکیہ کی طرف توجہ کر کے اپنی نجات کی راہ ڈھونڈتے اس انفرادیت نے عام طور پر رہبانیت پیدا کی اور لوگوں کو بالخصوص تصوف سے زیادہ دلچسپی بڑھی۔ اور دماغوں سے ملی مقصد اور اجتماعی نجات کا تصور ہی جاتا رہا۔

میں یہ پہلے کہہ چکا ہوں کہ اسلام سارے انسانوں کے لئے نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی زندگی کا مکمل نظام ہے جو اللہ کا مقرر کیا ہوا ہے۔ اس کے خلاف جو نظام بھی قائم ہوگا وہ غیر اسلامی اور اللہ کی مرضی کے خلاف ہوگا۔ یہ اسلامی نظام ان پانچوں ارکان کی ادائیگی پر قائم ہے جس سے انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

پہلا رکن توحید جیسا کہ میں نے کہا دین اسلام کی بنیاد ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کا انفرادی اور اجتماعی مقصود حیات صرف اکیلے اللہ کی رضامندی ہے اور بس۔ اور یہ اسی کی اطاعت سے مل سکتا ہے۔ سارے قرآن کو آپ چھان ڈالیے اس میں سوائے اکیلے اللہ کی اطاعت کے اور مطلقاً کسی کی اطاعت کا حکم نہیں پائیں گے یہ اطاعت الٰہی بذریعہ رسول کے ہوتی ہے۔ اور یہ آپ کو

معلوم ہے کہ رسول ایک منصب ہے۔ نام نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو فریضے تھے۔

(۱) پیغمبری۔ یعنے اللہ کے پیغامات کو اس کی مخلوق کے پاس بلے کم وکاست پہنچا دینا۔
اس منصب کے لحاظ سے آپ کو کسی سے مشورہ لینے کا حکم نہیں تھا بلکہ صرف یہ فرمان تھا
یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ (اے رسول جو کچھ تجھ پر تیرے رب کی طرف سے
نازل کیا گیا ہے اسے دوسروں تک پہنچا دے۔

(۲) امامت۔ یعنے احکام الٰہی کے مطابق ان کو چلانا۔ ان کے باہمی جھگڑوں اور قضیوں کے
فیصلے کرنا اجتماعی امور مثلاً جنگ وصلح وغیرہ میں ان کی قیادت اور نمائندگی کرنا وغیرہ۔

جہاں تک پیغام رسانی کا تعلق ہے یہ منصب خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ختم ہو گیا اور اس کی تکمیل اور اس کے ختم کرنے کے لئے وہ بھیجے ہی گئے تھے۔ لیکن دوسرا منصب یعنے امامت قیامت تک مستمر ہے جس کو بذریعہ ان کے جانشینوں کے ہمیشہ قائم رہنا چاہیے تھا۔ اس جانشین کے لئے خلیفہ یا امام کا لفظ تاریخی طور پر مستعمل رہا ہے لیکن اب یہ دونوں الفاظ اس حد تک اپنے معانی سے دور ہو گئے ہیں۔ کہ ان کے بولنے سے صحیح مفہوم کا تصور مشکل معلوم ہوتا ہے اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کو مرکز ملت سے تعبیر کروں۔

اسی مرکز کی اطاعت خواہ براہ راست ہو خواہ اس مرکز کے مقرر کئے ہوئے امراء کے ذریعہ سے ہو اللہ کی اطاعت ہے یہ مرکز حکومت الٰہی کا نمائندہ ہے مخلوق کے لئے جو امام اور اس کے مشیروں پر مشتمل ہوگا۔ اور یہ ذمہ دار ہوں گے کہ ملت کو قرآن کے مطابق چلائیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بعد سے یہی مرکزیت امت کی جاتی رہی۔ اور ملت میں لامرکزیت اور انفرادیت پیدا ہوئی جو دن بدن اس کو انتشار اور تشتت کی طرف لئے چلی جا رہی ہے۔

اس بیان سے میرا مقصد اس امر کی توضیح ہے کہ دین اسلام نے جو دین الٰہی اور ازلی اور ابدی دین ہے موحدوں کا مرکز صرف اطاعت الٰہی کو قرار دیا ہے۔ یہی وہ مرکز ہے جس سے بنی نوع انسان کے جملہ باہمی جھگڑے اور مناقشے ختم ہو سکتے ہیں اور سب کے سب وحدت اطاعت کی بدولت متحد ہو سکتے ہیں

دوسرے لفظوں میں یہی مرکزیت امنِ عالم کا نقطہ ہے جس پر ایک نہ ایک دن دنیا کو آنا پڑے گا۔ لیکن یہ مرکز عقلی ہے اس لئے اس کی اطاعت کے لئے محسوس مرکز کی ضرورت تھی جو منصبِ رسالت سے پورا کیا گیا۔ رسول کے بعد اس کے جانشین ملت سے یہ اطاعت لیں گے۔ اور اللہ کے مقرر کئے ہوئے اصول اور احکام یعنی اس کی اتاری ہوئی کتاب کے مطابق اس کو چلائیں گے۔

اس مرکز سے مقرر کئے ہوئے امراء کے ساتھ تو قرآن جمہور کو اختلاف اور تنازع کا حق دیتا ہے لیکن اصل مرکز سے کسی کو نہ سرتابی کا حق ہے نہ منازعت کا۔ قرآن نے اس کی تصریح کر دی ہے۔

مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهٗٓ أَمْرًا أَنْ يَّكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ

(کسی مومن مرد یا عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور رسول (مرکز) کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو پھر ان کو اپنے معاملہ میں اختیار باقی رہے)

امراء اور جمہور کے تنازع کی صورت میں اس کا فیصلہ مرکز کرے گا جیسا کہ قرآن نے حکم دیا ہے۔

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ۔

(اگر تم کسی بات میں آپس میں جھگڑ پڑو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف مسترد کر دو)

اس طرح ہر بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے معاملہ کا فیصلہ ہو جایا کرے گا اور امت میں کوئی تفریق اور کوئی تنازع قائم نہ رہے گی۔

امام کے ساتھ مشیروں کی ایک جماعت کا ہونا قرآن کی تعلیم وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ یعنے ان کی حکومت باہمی مشورہ سے ہوگی۔ کے مطابق لازم ہے۔ اور قرآن کی ہدایت شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ یعنے امورِ حکومت میں مشورہ لو۔ کے مطابق امام مامور ہے کہ ان کے مشورہ سے کام کرے۔

یہی امام و مشیروں کی جماعت ملت کی مرکزی جماعت ہے۔ اس مرکزی جماعت کا نصب کرنا جہاں تک میں قرآن سے سمجھ سکا ہوں ملت کا فریضہ ہے۔ کیونکہ اپنی کتاب میں کہیں اللہ نے خود اس مرکز کے نصب کر دینے کی ذمہ داری نہیں لی ہے۔ جو لوگ امام منصوص کے قائل ہیں ان کے پاس کوئی قرآنی سند نہیں ہے۔

اس مرکزی جماعت کا اصولی قانون اور دستور العمل صرف کتاب اللہ ہے۔ اسی کے مطابق ہر زمانہ میں اس

کی ضروریات کے لحاظ سے ضابطے بنائے جائیں گے۔ یہ ضوابط کسی خاص قبیلہ یا قوم یا مخصوص کنبہ یا خاندان کے فائدہ کے لئے نہیں ہو سکتے بلکہ یہ حکومت الٰہی ہو گی جس کا مقصد صرف اقامت حق اور اعلائے کلمۃ اللہ ہوگا تاکہ ہر انسان صحیح طور پر اللہ کا بندہ اور خلیفہ فی الارض ہو سکے جس کے لئے اس کی تخلیق ہوئی ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

(میں نے نہیں پیدا کیا جن و انس کو مگر اس لئے کہ وہ میرے بندے بنیں۔)

جب ہم بولتے ہیں کہ مسلمانوں کا مذہب اور ان کی سیاست ایک ہے تو اس سے مراد ہماری یہی سیاست ہوتی ہے جو حکومت الٰہی ہے اور ہمارا دین ہے۔ بخلاف اس کے آج کل جو مسلمانوں کی ہر جماعت اس قسم کے نعرے لگاتی ہے اس کا مفہوم میری سمجھ سے باہر ہے۔ کیونکہ میں تو دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں کی سیاست اور ان کا مذہب خلافت راشدہ کے بعد ہی سے الگ الگ ہیں۔

اسلام سوائے اس حکومت الٰہیہ کے بقیہ جملہ اقسام کی حکومتوں کو طاغوتی قرار دیتا ہے۔ بادشاہت جس کا تسلط خلافت راشدہ کے بعد سے مسلمانوں پر ہوا اور جس کے ساتھ آج تک بھی ان کا ایک حصہ بدقسمتی سے وابستہ ہے وہ تو اکثر حالتوں میں دنیا کے لئے ایک مصیبت ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ بادشاہ اور اس کے ارکان حکومت وزراء اور امراء اور عمال اور فوج سب مل کر اپنی قوت سے پورے ملک کے باشندوں کو تاج کا غلام بنا لیتے ہیں اور رعایا کی محنت کو اس کے اور اس کے تحت میں اپنے فائدہ کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

آج کل جمہوریت اور ڈکٹیٹر شپ دو قسموں کی حکومتیں دنیا میں زیادہ نمایاں اور باہم دگر برسرپیکار ہیں۔ لیکن اسلام مروجہ اصطلاحی معنوں میں نہ جمہوریت کو صحیح قرار دیتا ہے نہ ڈکٹیٹر شپ کو۔ کیونکہ جمہوریت میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ حق حکومت جمہور کو حاصل ہے جس کو وہ اپنے نمائندوں کے سپرد کرتے ہیں جس سے وہ نمائندے حکومت اور وضع قوانین کے مجاز ہو جاتے ہیں۔ اور ڈکٹیٹر شپ میں، ڈکٹیٹر، یعنی مختار مطلق کی ذات میں حق حکومت تسلیم کیا جاتا ہے اور اسلام تو کسی انسان یا کسی انسانی جماعت میں حکومت کا حق نہیں مانتا بلکہ حکومت کو صرف اللہ کا حق قرار دیتا ہے۔ قرآن میں ہے۔

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ

(نہیں ہے حکومت مگر اللہ کے لئے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ تم سوائے اس کے کسی کے بندے نہ بنو)

دوسری جگہ فرمایا ہے۔

وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا

(اللہ نے اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں گردانا)

خود انبیاء کرام کو بھی یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ انسانوں کو اپنا غلام بنائیں بلکہ صرف یہ کہ ان کو اللہ کی اتاری ہوئی کتاب کے مطابق چلائیں۔ جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ

(کسی شخص کو جسے اللہ کتاب حکم اور نبوۃ بخشے یہ حق نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بنو۔ بلکہ اللہ والے بنو۔ اس کے مطابق جو تم کتاب کو پڑھاتے اور پڑھتے ہو۔)

اس لئے ملت اسلامیہ کی مرکزی جماعت صرف قرآنی قوانین الٰہی کے نفاذ کا اختیار رکھتی ہے۔ اسی کی روشنی میں ہنگامی ضروریات کے لئے وہ ضوابط تیار کرے گی۔ اور کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکے گی جو قرآن سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔

(اور جو کوئی اللہ کے اتارے ہوئے اصول کے مطابق حکم نہ دے وہ ظالم ہے)

ان دو مرکزوں یعنے اللہ کی حکومت اور مرکز ملت کی اطاعت کے لئے تیسرا ایمانی اور اعتقادی مرکز ملت اسلامیہ کا قرآن کریم ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے جس کی تعلیمات کسی زمانہ اور کسی ملک کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ابدی اور حقیقی ہیں جو ہر ماحول اور ہر زمانہ میں اٹل ہیں۔ کیونکہ یہ اس علیم و خبیر کی کتاب ہے جو زمان و مکان سے بالاتر ہے اور جملہ حقائق کا علم رکھتا ہے۔ اس سے نصیحت ہر فرد مسلم لے سکتا ہے مگر اس کو اجتماعی طور پر استعمال کرنے کے لئے اس کی تشریح و توضیح اور اس کے اصول سے زمانہ کے اقتضا کے مطابق فروع کے اخذ کرنے کا حق صرف مرکزی جماعت ہی کو حاصل ہے۔ بے شک قرآن ہر صاحب عقل کو

دعوت دیتا ہے کہ آیات میں غور و فکر کرے۔ لیکن کسی کی کوئی تشریح اس وقت تک اُمّت کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی جب تک کہ مرکز اس کو تسلیم نہ کرے۔ اسی طرح کوئی تلقین کوئی وعظ کوئی ارشاد یا رہنمائی امت کی بلا اجازت مرکز کے غلط قرار دی جائے گی۔ یہ بات اس موقع پر اجمالاً بیان کی گئی ورنہ اس کی مزید توضیح خود ایک جداگانہ مقالہ کی محتاج ہے۔

جو مقام مرکز اسلام کا مقامی ہے یعنی بیت اللہ جو توحید پرستوں کی پہلی مسجد ہے اور جس کے معمار حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے جو موحدوں کے پیشوائے اعظم ہیں۔ جنہوں نے بحکمِ الٰہی اکیلے اللہ کی عبادت کے لئے اس گھر کو بنایا اس وقت جب کہ دنیا میں کوئی دوسری مسجد نہ تھی۔

اللہ نے اس گھر کو برکت عطا کی اور سرچشمۂ ہدایت بنایا۔ جیسا کہ قرآن میں ہے۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ۔

(پہلا (توحید کا) گھر جو انسانوں کے لئے بنایا گیا ہے وہ جو مکہ میں ہے۔ برکت والا اور دنیا جہان کیلئے ہدایت ہے)

جب یہ گھر تیار ہو گیا تو اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ لوگوں میں اعلان کر دو کہ یہاں حج کیلئے آیا کریں۔

وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ

(اور انسانوں میں حج کا اعلان کر دے۔ وہ تیرے پاس پیادہ اور لاغر سواریوں پر دور دراز آتی ہیں آئیں گے)

یہ اعلان کل انسانوں کے لئے کیا گیا جیسا کہ لفظ فی النّاس سے ظاہر ہے لیکن مراد یہاں بنو نوع انسان کے موحدین ہیں کیونکہ اس گھر کی بنیاد توحید پر رکھی ہے۔ اور قرآن نے اس میں غیر موحدوں کا داخلہ روکا ہے۔

إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَٰذَا۔

(مشرک تو نجس ہیں اس سال کے بعد وہ مسجدوں کے پاس بھی نہ بھٹکیں۔)

یہاں ضمناً یہ بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی اسلام سے کہ روزِ اوّل سے وہی دینِ الٰہی ہے اور تمام انبیاء سابقین کے ذریعہ سے اسی دین کی تلقین دنیا کو کی گئی ہے۔ اور یہی دین آخر میں حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل کیا گیا ہے جملہ انسانوں کو یکساں قرار دیا ہے۔ اور نسل۔ رنگ۔ ملک یا زبان کے

اختلاف سے ایسی کوئی تفریق نہیں کی ہے۔ ہاں ایک تفریق وہ ضروری قرار دیتا ہے یعنی اسلام اور کفر۔ جو لوگ عہد الست پر قائم ہیں اور انبیاء کے ذریعے سے ملی ہوئی تعلیم کے تابع، ان کو وہ اولیاء الرحمٰن کہتا ہے اور جو لوگ شرک یا کفر میں مبتلا ہیں ان کو اولیاء الشیطان۔ یہ تفریق بلا امتیاز قوم و نسل قائم رہی ہے اور قیامت بلکہ جنت اور دوزخ تک رہے گی۔

الغرض کعبہ کو اللہ نے موحدوں کا بین الاقوامی مرکز قرار دیا اور خاتم النبیینؐ کے عہد میں اس مرکزیت کو مستحکم کرنے کے لئے جملہ ملت اسلامیہ کا قبلۂ نماز بھی اسی کو بنا دیا۔ آج حضرت ابراہیمؑ کے اعلان کو کم و بیش چار ہزار سال ہو گئے ہیں اور حج کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اور سالانہ اس مرکز میں دنیا کے چاروں گوشوں سے موحد آ کر جمع ہوتے ہیں۔ اللہ نے صرف اس مکان کو بلکہ اس زمان کو بھی مرکزی حیثیت کے لحاظ سے احترام بخشا جس میں یہ اجتماع ہوتا ہے۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَائِدَ

(اللہ نے کعبہ بیت اللہ کو انسانوں کے لئے وارد قرار دیا نیز ماہ حرام کو قربانی کے جانوروں کو)

اس آیت میں کعبہ کی مرکزیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ موحدوں کی بین الاقوامی انجمن کا مرکز ہے اور وہیں سے جملہ اجتماعی امور سرانجام پائیں گے۔ اور جس زمانہ میں یہ اجتماع ہوتا ہے اس زمانہ یعنی ذی قعدہ۔ ذوالحجہ اور محرم تینوں مہینوں کو محترم مہینے قرار دیا جس میں ہر قسم کی لڑائی روک دی جاتی ہے تاکہ لوگ امن اور فارغ البالی سے اس اجتماع میں شریک ہو سکیں۔ اس اجتماع کی غرض بھی اللہ نے صرف ایک مختصر جملہ میں بیان کر دی ہے یعنی

لِّيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ　　　تاکہ لوگ اپنے فائدوں کے لئے آن موجود ہوں۔

یہ فائدے کچھ اخروی ثواب ہی تک محدود نہیں ہیں۔ بلکہ دینی۔ دنیاوی۔ ملکی۔ ملی۔ سیاسی۔ تجارتی۔ علمی اور عقلی وغیرہ ہر قسم کے فائدے اس میں داخل ہیں۔ اور یہی رکن ہے جس سے ملت کی ہر قسم کی خرابیوں کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ یہی مرکزیت باعث ہوئی کہ قرآن نے مسجد الحرام کے بین الاقوامی ہونے کا اعلان فرمایا۔

سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ۔　اس میں باشندے اور غیر باشندے یکساں ہیں۔

جس کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قرآنی بصیرت رکھنے والی جماعت نے جس میں حضرت عمرؓ اور عبد اللہ بن عباسؓ وغیرہ بھی شامل ہیں پورے شہر مکہ کو بین الاقوامی قرار دیا۔ اور وہاں کے کسی

باشندے کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ کسی آفاقی اور باہر سے آنے والے حاجی کو اپنے گھر میں قیام سے روک سکے۔ بلکہ وہ مکہ کے گھروں میں کواڑ لگانے کو بھی پسند نہ کرتے تھے اور اگر کتوں وغیرہ سے تکلیف کا خیال نہ ہوتا تو اس کی اجازت بھی نہ دیتے۔

اب اگرچہ اعتقادی طور پر یہ چاروں مرکزیتیں ملتِ اسلامیہ میں باقی ہیں لیکن سوائے کعبہ کی مرکزیت کے جس کی طرف مسلمان رخ کر کے نمازیں پڑھ لیتے ہیں اور سال میں حج کے لئے وہاں جمع ہو جاتے ہیں عملاً کوئی مرکز ان کا باقی نہیں رہا۔ مالک عرش بریں کے ساتھ اب بہاں مالک زمین پر اور حاجت روا زیر زمین مان لئے گئے ہیں جن کی زیارت اور پوجا ہوتی ہے رسول کی جگہ ہر وہ شخص لے بیٹھا ہے جو علماء کا لباس پہن کر لوگوں کی رہنمائی کے لئے کھڑا ہو جائے اور قرآن کے بجائے انسانی کتابیں دستور العمل بنی ہوئی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اب امتِ اسلامیہ کے افراد صرف انفرادی حیثیت سے مسلمان ہیں اور اجتماعی حیثیت کا نام ہی باقی رہ گیا ہے اب اجتماعی اسلام کے لئے ملت کا فریضہ یہ ہے کہ ان چاروں مرکزوں پر لوٹ کر آ جائے۔ یعنے اللہ کی اطاعت۔ مرکزی جماعت۔ قرآنی حکومت۔ اور کعبہ کا بین الاقوامی سالانہ اجتماع مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ یہ ہو کر رہے گا۔

یہاں پر یہ سوال کیا گیا کہ اس اجتماعیت کے نئے سر سے پیدا ہونے کی صورت کیا ہے؟

جواب میں کہا گیا کہ ہم میں سے کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو مایوسی یا نادانی سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ مذہب ایک شخصی اور انفرادی چیز ہے اس کو اجتماعی ہونے کی ضرورت ہی نہیں۔ لیکن یہ خیال قرآن کے بالکل خلاف ہے۔ وہ دین جو سارے عالم کی اصلاح اور ہدایت اور دنیا میں سرتاسر امن قائم کرنے کے لئے آیا ہے۔ وہ شخصی یا انفرادی کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس کے انفرادی اعمال بھی مقصود و تزکیہ نفس اور اللہ کا تقویٰ ہے تاکہ افراد جماعت کا جزو صالح ہو سکیں۔ اس لئے مذہب کے انفرادی ہونے کا خیال دینِ اسلام کے متعلق نہ صرف غلط بلکہ باطل ہے۔

دوسری جماعت ہم میں ایسی ہے جو یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ امام مہدی آئیں گے جب کچھ کر دیں گے۔ بعض لوگ امام مہدی کے تو قائل نہیں لیکن یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی بلند شخصیت ایسی پیدا ہو گی جو

اپنے شخصی وقار اور اقتدار سے ملّت کو ایک مرکز پہ لائے گی مگر نتیجہ ان دونوں باتوں کا ایک ہی ہے یعنی وہ خود کچھ نہیں کرنا چاہتے۔ یہ خیالات اگرچہ بہت اطمینان اور تسلی کا باعث ہو سکتے ہیں مگر ان کی کوئی قرآنی سند نہیں ملتی۔ میرا خیال یہ ہے کہ موجودہ انقلابات جو عجلت کے ساتھ اقوام و ملل پر آرہے ہیں ان میں ایک ایسا وقت آجائے گا کہ مسلمان جن خطوں میں آباد ہیں ان میں آزاد سیاسی جمہوریتیں قائم کر سکیں گے۔ اور پھر جس کے بین الاقوامی اجتماع سے کام لے کر وضع قوانین میں پوری ملت کو ہم آہنگ کرنے کے لئے وہ ساری جمہوریتیں اپنا ایک ملی مرکز قائم کریں گی جس کے لئے مکہ سے بہتر کوئی موزوں مقام نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح رفتہ رفتہ باللہ کی مدد سے ملت ایک مرکز پر آسکے گی۔ میں اپنی قرآنی بصیرت سے دیکھ رہا ہوں کہ مسلمانوں میں خیر امت ہونے کے امکانات موجود ہیں اور باوجود ہزاروں خرابیوں کے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم الشان روحانی برکتوں سے نہ اب تک یہ اللہ کو بھولے ہیں اور نہ اللہ نے ان کو بھلایا ہے۔ صرف رجوع الی اللہ کی ضرورت ہے کہ نسیان نفس کے پردے اٹھ جائیں اور ہم اپنے کو پہچان سکیں اور پھر سب مل کر ایک اور ایک ہی مالک کے بندے بن جائیں۔

باب المراسلات

قربانی

ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"پچھلے سال قربانی کے متعلق ایک مختصر سا نوٹ طلوعِ اسلام میں شائع ہوا تھا۔ بہتر ہو کہ اس مسئلہ پر آپ کچھ تفصیل سے لکھیں۔"

طلوعِ اسلام

اجمال ہو یا تفصیل۔ بات تو صرف اتنی ہے کہ یہ جو ہم بقرعید کے موقعہ پر ہر شہر اور ہر قریہ، ہر گلی اور ہر کوچہ میں بکرے اور گائیں ذبح کرتے ہیں یہ قرآن کے کس حکم کی تعمیل ہے۔ اور جواب یہ ہے کہ قرآن میں اس کے متعلق کوئی حکم نہیں، یہ ایک رسم ہے جو ہم میں متوارث چلی آرہی ہے اور تقلید کے زور دروں (MOMENTUM) سے غیر شعوری طور پر آگے بڑھتی جارہی ہے۔ جب کسی قوم کے اعصاب تقلید اٹھے سے مفلوج ہوجاتے ہیں تو وہ قوم فکر و تدبر کے جوہر سے عاری ہوجاتی ہے۔ نہیں! بلکہ غور و فکر اس کے ہاں "شجرِ ممنوعہ" قرار پاجاتا ہے جس کے چھونے سے انسان جنت سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ اس باب میں مسلمان دنیا کی دیگر "مذہب پرست" قوموں سے بھی گیا گزرا ہوچکا ہے۔ اس لئے کہ اُن کے پاس مذہب کا سرمایہ ہی اُن کی رسومات و روایات ہیں جو اُن میں نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلی آرہی ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی بدبختی یہ ہے کہ ان کے پاس ان کے خدا کی کتاب ایک حرف کے تغیر و تبدل کے بغیر موجود ہے اور یہ اسے پس پشت ڈال کر رسوم و روایات کو مذہب بنا کے بیٹھے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ ان کے تمام ذرائع علم پر مہریں لگ چکی ہیں وَهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ (۲/۱۵) اور یہ بڑے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔

جب شعورِ انسانی اپنے عہدِ طفولیت میں تھا تو اس نے خدا کو انسان کی شکل پر ڈھال رکھا تھا انسانی ذہن اس سے آگے جا ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ تو صرف وحی کی روشنی ہے جو اسے ذہن کے حدود سے ماوراء لے جا سکتی ہے۔ اس کا خدا" (یعنی دیوتا) انسانوں کی طرح ناراض بھی ہوجاتا تھا اور انہی کی طرح خاطر و خوشامد اور نذر و تحائف سے من بھی جاتا تھا۔ گوشت اور خون چونکہ اس زمانہ کے انسان کی مرغوب ترین

خوراک تھی اس لئے وہ اپنے دوسرے سوتے "خدا" کو اسی سے مناتا تھا۔ اسی سے مردوں کی روحوں کو بھی خوش کیا جاتا تھا۔ لیکن چونکہ مردے گوشت کو اس کی ٹھوس شکل میں کھا نہیں سکتے تھے اس لئے اسے آگ میں جلا کر اس کی خوشبو کو ان تک پہنچایا جاتا تھا۔ بعض اوقات یہ بھی سمجھا جاتا تھا کہ دیوتا بالخصوص سورج دیوتا، کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں اس لئے ان کی تقویت کے لئے تازہ خون اور گوشت یا اس کی سوختنی لطافت کی ضرورت ہے قدیم یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ سورج اپنے رتھ میں دن بھر آسمان کی مسافت سے تھک کے شام کو سمندر میں چلا جاتا ہے۔ چونکہ اس سے یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ اس پیہم سفر سے اس کا رتھ بوسیدہ اور اس کے گھوڑے ماندہ ہو جاتے ہوں گے اس لئے وہ ہر سال ایک مضبوط سا رتھ اور چار تنومند گھوڑے سمندر میں ڈبو دیتے تھے۔

پھر آہستہ آہستہ یہ خیال پیدا ہو گیا کہ دیوتا کے حضور ایسی قربانی دینی چاہیے جو انسان کو سب سے زیادہ محبوب ہو۔ موسم کا اولین پھل، کھیتی کی پہلی پیداوار، مویشیوں کے پہلے بچے۔ اور انسانی قربانی کرنے والوں میں، پہلوٹھا بچہ، بہترین قربانی متصور ہوتا تھا۔

غرضیکہ یہ تھے ذہن انسان کے عہد طفولیت کے کھیل۔ آسمانی روشنی آتی رہی اور انسانی ذہن کو ان توہمات سے نکالتی رہی۔ لیکن اس کے مدھم پڑ جانے پر وہ پھر اپنی کھیلوں میں مشغول ہو جاتا رہا۔ حتیٰکہ قرآن آیا اور اس نے انسانی تاریخ میں ایک ایسا عظیم القدر انقلاب پیدا کیا کہ اس سے پہلے اور بعد کی دنیا، یکسر دو الگ الگ دنیائیں نظر آنے لگ گئیں۔ اس نے دین کی عمارت کو انسانی فطرت اور بصیرت کی محکم بنیادوں پر استوار کیا اور توہم پرستی کی ایک ایک زنجیر کو توڑ کر رکھ دیا۔ پھر اس مقصد کے پیش نظر کہ یہ زنجیریں پہلے کی طرح پھر انسان کے گلوگیر نہ ہو جائیں، اس نے قرآن کو قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا تاکہ سفر زندگی میں جو بھی کوئی دوراہے آئے یہ پکار کر کہہ دے کہ منزل مقصود تک لے جانے والی راہ کونسی ہے۔

لیکن ادھر مشیت یہ انتظامات کر رہی تھی اور ادھر ضلالت و غوایت کے شیاطین و ابالیس اس قسم کی تدبیریں سوچ رہے تھے کہ ان انتظامات و تحفظات کے باوصف، اس قوم کو کس طرح پھر انہی راستوں پر ڈالا جائے جہاں سے قرآن اور صاحب قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) نے انہیں نکالا تھا اور جو انسان کو سیدھے تباہی اور بربادی کے جہنم کی طرف لے جانے والے تھے۔ چنانچہ یہ اپنے حیل و مکائد میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے، قرآن کی موجودگی میں مسلمانوں کو یکسر قرآن سے الگ کر دیا حتیٰکہ آج حالت یہ ہے کہ انہیں خالص قرآن کی طرف دعوت دینے والا گمراہ کرنے والوں میں سے دکھائی دیتا ہے۔ نگاہوں کے زاویوں کو اس درجہ

پھیر دیا اور انسانی فطرت کو اس قدر مسخ کر دیا، ابلیسی سازشوں کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

قرآن نے، دین کے اجتماعی نظام کے قیام اور استحکام کے لئے، ملتِ اسلامیہ کے اربابِ فکر و نظر کا ایک سالانہ اجتماع تجویز کیا تھا جو حج کے نام سے موسوم ہے۔ اس اجتماع کا قیام مکہ کی بے برگ و گیاہ وادی میں کعبہ کا مرکزی نقطہ تھا۔ (اس مقصدِ عظیم کے لئے اس مقام کو کیوں متعین کیا گیا یہ ایک الگ بحث ہے اور جداگانہ تفصیل کی محتاج) اہلِ مکہ کے لئے اتنے عظیم الشان اجتماع کی مہمانداری مشکل تھی۔ یوں بھی اس وادی میں پیداوار بھی بہت کم ہوتی تھی اور اسبابِ نقل و حرکت کی بھی کمی تھی۔ اس کے لئے تجویز یہ کیا گیا کہ اس اجتماع میں شریک ہونے والے نمائندے اپنے ساتھ اپنے جانور لیتے آئیں۔ راستہ میں ان سے سواری اور باربرداری کا کام لیں اور قیامِ مکہ کے دوران میں انہیں اپنی خوراک بنائیں۔ خود بھی کھائیں اور وہاں کے رہنے والے ضرورت مندوں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیں۔ یہ تھی حقیقت ان جانوروں کی جو حج کی تقریب پر مکہ میں ذبح کئے جاتے تھے۔ قرآن میں ان کے اس مقصد اور ذبح کے مقام کے متعلق واضح تصریحات موجود ہیں۔ سورۃ حج میں ہے۔

لَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ

ان چارپاؤں میں تمہارے لئے ایک وقتِ معینہ تک کے لئے فائدے ہیں۔ پھر انہیں خانہ کعبہ تک پہنچانا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ راستہ میں ان جانوروں سے کام لیا جائے گا۔ (انہیں "بتوں کا ساتھ" سمجھ کر مقدس نہیں تصور کر لیا جائے گا) اور پھر خانہ کعبہ تک پہنچا کر انہیں ذبح کیا جائے گا۔ ذبح کر کے خود بھی کھایا جائے گا۔ اور دیگر ضرورت مندوں کو بھی کھلوایا جائے گا۔

يَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۖ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ ۔

ہم نے جو مویشی ان کے لئے مہیا کر دئے ہیں۔ انکو ذبح کرتے وقت، معلوم دنوں میں اللہ کا نام لیں۔ پھر ان کا گوشت خود بھی کھائیں اور بھوکے ضرورت مندوں کو بھی کھلائیں۔ ایسی کھلی ہوئی تصریحات کے بعد پھر تاکیداً سمجھا دیا کہ دیکھنا! کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ چڑھاوے کے جانور ہیں جن کا گوشت پوست خدا تک پہنچتا ہے یہ عقیدہ باطل ہے خدا دیوتا نہیں کہ اس کے استھان پر قربانیوں کا گوشت اور خون چڑھاؤ۔ یہ جانور تمہارے اپنے ہی فائدے کے لئے ہیں۔ خدا تو صرف یہ دیکھتا ہے کہ جس مقصدِ عظیم کے لئے تم جمع ہوئے ہو اسے کس حد تک پورا کرتے ہو۔ (اور تقویٰ کا یہی مفہوم ہے) چنانچہ فرمایا کہ

فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۔ لَنْ يَنَالَ

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ۔

ان کے گوشت میں سے خود بھی کھاؤ اور دیگر زائرین اور حاجتمندوں کو بھی اس میں شریک کرلو۔ اس طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے تاکہ تم انہیں صحیح مصرف میں لاؤ (شکر) یاد رکھو۔ ان کا گوشت اور خون اللہ تک نہیں پہنچتا۔ اس تک تو جو کچھ پہنچ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ تم نے اپنے فریضہ منصبی کو کس حد تک پورا کیا ہے۔ اور یہ فرض منصبی کیا ہے؟ "لتکبروا اللہ" تاکہ تم ساری دنیا سے منوا لو کہ اقتدار اعلیٰ صرف خدا کو حاصل ہے۔ اس سے بڑا کوئی نہیں ہے۔ حج کے اجتماع کا مقصد ہی یہ تھا کہ ملت اسلامیہ کے نمائندے ایک ایسا لائحہ عمل تیار کریں جس سے ساری دنیا میں آئین خداوندی نافذ ہو سکے ویکون الدین للہ اور اطاعت صرف خدا کی باقی رہ جائے۔ اسی لئے اس اجتماع اور اس کے جملہ متعلقات و تضمنات کو نوع انسانی کے "قیام" کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ۔ (سورۃ مائدہ)

کعبہ بیت الحرام (جہاں یہ اجتماع ہوتا ہے) اور حرمت والے مہینے (جن میں اس اجتماع کا انعقاد ہوتا ہے) اور قربانیوں کے جانور (جو اس اجتماع میں شریک ہونے والوں کے لئے خوراک بنتے ہیں) ان کو اللہ نے نوع انسانی کے قیام (و بقا) کا ذریعہ بنایا ہے۔

بس یہ تھی قربانی کی اصل و غایت۔ سارے قرآن میں کسی ایک جگہ بھی یہ نہیں لکھا کہ مکہ کے علاوہ کسی اور جگہ بھی قربانی دی جائے گی (قربانی کا لفظ بھی قرآنی نہیں ہے)۔ اسے سامنے رکھئے اور پھر اس کے بعد دیکھئے کہ آج کل آپ کے یہاں کیا ہو رہا ہے۔ اول تو حج ہی اپنے مقصد کو چھوڑ کر محض "یاترا" بن کر رہ گیا ہے۔ حاجی وہاں جاتے ہیں تاکہ اپنے تمام سابقہ گناہ آب زمزم میں دھو کر اس طرح واپس آجائیں جس طرح ایک بچہ اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو۔ جب اصل موضوع ہی اپنے مرکز سے ہٹ چکا ہو تو اس کے متعلقات کا اپنی غایت سے الگ ہو جانا کونسا مستبعد ہے۔ اب وہاں ہر حاجی دو چار جانور ذبح کر کے انہیں ریت کے گڑھوں میں دبا دیتا ہے اور خوش ہو جاتا ہے کہ میں نے "پل صراط" پار کرنے کے لئے سواری مہیا کر لی ہے۔ ادھر یہ کچھ ہو رہا ہوتا ہے اور باقی دنیا میں مسلمان ہر گلی کوچے میں بکرے اور گائیں ذبح کر کے ان کا گوشت اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں جسے دوسرے روز میونسپل کمیٹی والوں کو شہر سے باہر پھنکوانے کے لئے بلدیہ کو خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ یہ کچھ ہزار برس سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ اور کوئی اللہ کا بندہ اتنا نہیں سوچتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ ہے ایک بین مثال اس حقیقت کو سمجھنے کی کہ جب دین (یعنی نظام حیات اجتماعیہ) "مذہب" (انفرادی نجات کے لئے رسومات کا مجموعہ) بن کر رہ جاتا ہے تو دین کے وہی عناصر جن سے ایسے درخشندہ نتائج مرتب ہوا کرتے تھے کہ ان سے قیصر و کسریٰ کے محلات الٹ جاتے

میں منتقل واقعہ ہو جاتا تھا۔ کس طرح بے جان اور بے روح عقائد اور بے معنی اور بے مقصد رسومات میں تبدیل ہو جاتے ہیں جن کا نتیجہ دنیا اور آخرت دونوں کا زیاں ہوتا ہے۔ مذہبی رسومات کی ان دیمک خوردہ لکڑیوں کو قائم رکھنے کے لئے طرح طرح کے سہارے دیے جاتے ہیں۔ کہیں قربانی کو سنت ابراہیمی قرار دیا جاتا ہے۔ کہیں اسے صاحب نصاب پر واجب ٹھہرایا جاتا ہے۔ کہیں اسے تقرب الٰہی کا ذریعہ بتایا جاتا ہے۔ کہیں دوزخ سے محفوظ گزر جانے کی سواری بنا کر دکھایا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم کے متعلق قرآن میں ہے کہ آپ نے خواب دیکھا کہ آپ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ آپ نے سمجھا کہ یہ اشارہ غیبی ہے اس لئے اس کی تعمیل ضروری۔ بیٹے سے ذکر کیا تو اس نے بھی کہا کہ اگر یہ حکم ہے تو اس کی تعمیل میں قطعاً تامل نہ کیجئے میں ذبح ہونے کے لئے تیار ہوں۔ آپ نے بیٹے کو لٹایا اور اس کے گلے پر چھری رکھ دی، کہ اللہ نے پکارا کہ اے ابراہیم! تم نے خواب کو حکم خداوندی پر محمول کر کے اس کی یوں تعمیل کر دی اس لئے ظاہر ہے کہ اگر تمہیں بڑی سے بڑی قربانی کا بھی حکم دیا گیا تو تم اسے بلا تامل ادا کرو گے۔ یقیناً تم باپ اور بیٹا دونوں اطاعت و تسلیم کے بلند ترین مقام پر فائز ہو۔ اس بیٹے (حضرت اسماعیل) کو اللہ نے کعبہ کی تولیت کے لئے منتخب کر لیا۔ قرآن میں بس اتنا ہی واقعہ ہے۔ توریت میں البتہ یہ بھی ہے کہ جبریل نے جنت سے ایک مینڈھا لا کر اسے اس بیٹے کی جگہ لٹا دیا۔ اور چھری بیٹے کی جگہ مینڈھے کی گردن پر چل گئی۔ لیکن یہ تو اسرائیلی افسانوں میں سے ایک افسانہ ہے۔ قرآن اس کی تائید نہیں کرتا۔ اب اس پر غور کیجئے کہ اس قربانی کو جو ہمارے یہاں مروج ہے، سنت ابراہیمی قرار دینا بھلا کس نسبت سے ہے؟ پھر تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ خود رسول اللہ نے بھی مدینہ میں قربانی نہیں دی۔ حج سنہ ۹ھ میں فرض ہوا۔ حضور اس سال خود تشریف نہیں لے گئے۔ لیکن اپنی طرف سے کچھ جانور امیر کارواں حضرت ابوبکر صدیق کے ساتھ کر دئیے کہ وہاں مصرف میں لائے جائیں۔ اگلے سال حضور خود حج کے لئے تشریف لے گئے اور وہیں جانور ذبح کئے۔ لہٰذا ہر جگہ قربانی دینا نہ حکم خداوندی ہے۔ نہ سنت ابراہیمی اور نہ ہی سنت محمدی۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں حاجی قربانی دیتے ہیں اور باقی جگہ کے مسلمان ان کی ہم آہنگی میں اپنی اپنی جگہ وہی کچھ کرتے ہیں۔ اس دلیل کی عنکبوتیت خود ہی واضح ہے۔ حاجیوں کی ہم آہنگی کے لئے سارے ارکان حج میں سے صرف قربانی ہی کو کیوں منتخب کیا جاتا ہے؟ پھر جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، قربانی تو وہاں کھانے پینے کا سامان مہیا کرنے کا ذریعہ تھی۔ اب جس طرح وہاں جانور ذبح کر کے دبائے جاتے ہیں۔ نہ وہ مقصد

خداوندی ہے اور نہ ہی ان کی ہم آہنگی میں ہر جگہ جانوروں کا ذبح کرنا کسی مقصد وغایت کو اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے۔ وہاں بھی سب کچھ ضائع کر دیا جاتا ہے اور یہاں بھی۔ وذالک خسران المبین

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب اس قربانی کے لئے کوئی حکم اور کوئی سند موجود نہیں تو ہزار برس سے یہ کس طرح متواتر چلی آرہی ہے۔ اس کے خلاف کسی نے آواز کیوں نہیں اٹھائی۔ یہ سوال بہت اہم ہے اور اس کا جواب اُس وقت ملے گا جب کوئی مردِ حق گو اسلام کی تاریخ (مسلمانوں کی تاریخ نہیں بلکہ اسلام کی تاریخ) لکھیگا۔ اس لئے کہ یہ سوال صرف ایک قربانی تک ہی محدود نہیں۔ یہ تو پورے کے پورے اسلامی نظام کو محیط ہے۔ وہ دین جو محمدؐ رسول اللہ نے دنیا تک پہنچایا تھا، اس کا کونسا گوشہ اور کونسا شعبہ ہے جس میں تحریف نہیں ہوچکی؟ تو پھر پوچھنے کا سوال یہ ہے کہ یہ کیا ہوا کہ ہزار برس سے اسلام میں ایسی کھلی ہوئی تحریف ہوتی چلی آرہی ہے اور کسی نے اس کے متعلق کوئی آواز نہیں اٹھائی (الا ماشاءاللہ) یہ سوال بڑا جگر خراش ہے اور اس کا جواب اس سے بھی کہیں زیادہ دل سوز اور جانگسل۔ اور یہ جواب، جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے، اس وقت پورے طور پر دیا بھی نہیں جاسکتا۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لیجئے کہ اسلام دنیا سے ملوکیت اور پیشوائیت (ملائیت) مٹانے کے لئے آیا تھا۔ وہ ابن آدم کو ذہنی اور روحانی دونوں حیثیتوں سے صرف خدا کا محکوم رکھنا چاہتا تھا، جو درحقیقت اس کی اپنی فطرتِ صالحہ کی محکومی کا دوسرا نام ہے۔ لیکن جب اُس دورِ حریت کے بعد پھر سے ملوکیت نے سر نکالا تو اس کے ساتھ ہی پیشوائیت کی وہ روح بھی اُبھری جسے قرآن نے مسل کر رکھ دیا تھا۔ اسلام اس طرح جگمگاتا دنیا کے سامنے آیا تھا کہ اسے یک لخت نگاہوں سے اوجھل کر دینا ممکن نہ تھا۔ ملوکیت کی ابلیسانہ دسیسہ کاریوں نے اس کے لئے تلبیس کا دام ہمہ رنگ زمین وضع کیا اور نہایت سادگی اور پرکاری سے وضع کیا۔ اس نے اسلام کے خارجی مظاہر کو بالکل اُسی طرح رہنے دیا لیکن ان میں سے روح پوری طرح سے کھینچ لی۔ اس غرض کے لئے اُسے پیشوائیت سے سمجھوتا کرنا پڑا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس سمجھوتہ کے بغیر کبھی بھی ملوکیت کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اس پیشوائیت نے جس کا ہمارے ہاں ملائیت نام ہے، آہستہ آہستہ مسلمانوں کو یہ افیون پلانی شروع کی کہ دنیا کے معاملات دنیاداروں کا حصہ ہیں جو مُردار کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ مذہب انسان کی "عاقبت" سنوارنے کے لئے ہے۔ اس نے جس قدر حکم دے رکھے ہیں ان کے متعلق یہ کبھی نہ پوچھو کہ ان کی غایت کیا ہے۔ یہ خدا کی باتیں ہیں جو خدا ہی جان سکتا ہے۔ مذہب میں عقل کا کوئی کام نہیں۔ تم صرف یہ سمجھ لو کہ فلاں بات کا حکم ہے۔ اس لئے

طلب کرنا ہے۔ اس کا ثواب" تمہارے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا اور یہ تمام پُرزیاں قیامت کے دن خزانہ میں رکھ کر تولی جائیں گی اور جنت میں لے جانے کا ذریعہ بن جائیں گی۔ یہ وعظ اس لئے تھا کہ اگر دین کے مختلف ارکان و عناصر کی علت غائی سامنے آ جاتی تو اس سے سب سے پہلے ملوکیت کی رگِ جان کٹتی تھی اور اس کے ساتھ ہی پیشوائیت کی۔ لہٰذا انہوں نے اس تلبیس سے دین کو مذہب میں تبدیل کر دیا۔ اب نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، جماعت، امام، وغیرہ کا مقصود رہ گیا عاقبت سنوارنا" اور عبادت سے مفہوم سمجھ لیا گیا خدا کی پرستش" کرنا۔ لیکن تنہا اس وعظ سے کامیابی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لئے کہ لوگ قرآن پڑھتے تھے اور اس میں اصل مقصود کی طرف راہنمائی کے نشانات (آیات) قدم قدم پہ ملتے تھے۔ لہٰذا اس باب میں بھی اُسی "تلبیس سے کام لیا گیا۔ اس کے لئے یہ عقیدہ پیدا کیا گیا کہ قرآن کا صحیح مفہوم ہر شخص نہیں سمجھ سکتا اس کے احکام مجمل ہیں اور ان کی تشریح و تفسیر رسول اللہ کے اعمال و اقوال میں ملتی ہے یہ بات بظاہر بڑی جچی تلی تھی اب اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ رسول اللہ کے وہ اعمال و اقوال کہاں سے ملیں گے جو قرآن کی تفسیر ہیں۔ اس کے لئے روایات وضع ہونی شروع ہو گئیں۔ اور اب "دین" میں حک و اضافہ اور تحریف و الحاق کا وہ دروازہ چوپٹ کھل گیا جسے ختم نبوت یعنی قرآن کی محفوظیت نے اس طرح بند کیا تھا۔ اب پوری آزادی تھی کہ جو جس کے جی میں آئے وضع کرے اور اسے رسول اللہؐ کی ذاتِ گرامی کی طرف منسوب کر کے روایات کے زمرہ میں شامل کر دے۔ ملوکیت قرآن کی نقیض تھی اس لئے ملوکیت کی حمایت میں جو کچھ کہا جاتا تھا اس کا خلافِ قرآن ہونا ظاہر تھا۔ اب دلوں میں یہ خلش پیدا ہوئی کہ کیا رسول اللہؐ کے اعمال و اقوال، قرآن کے خلاف بھی ہو سکتے ہیں؟۔ اس خلش کو دور کرنے کے لئے پہلے تو قرآن کی بے شمار آیات کو منسوخ قرار دیا اور جب اس سے بھی کام نہ چلا تو یہ عقیدہ پیدا کیا گیا کہ " حدیث قرآن کی ناسخ ہے"۔ اور اس پر قاضی بھی ۔چلئے سیدان صاف ہو گیا۔ قرآن رہ گیا محض ثواب کی خاطر پڑھنے اور اس کا ثواب مُردوں تک پہنچانے کے لئے۔ باقی رہا مذہب سو وہ روایات کے مجموعہ میں سمٹ کر آ گیا۔ اور جہاں روایات، قرآن کے مخالف وضع کرنی پڑیں اس اختلاف کو اس عقیدہ نے گوارا کرا دیا کہ حدیث، قرآن کی ناسخ ہے۔

ایک گروہ اور اٹھا اور اس نے کہا کہ قرآن اور حدیث دونوں کا صحیح مفہوم ائمہ فقہ کے فقہی فیصلوں میں ملے گا۔ جو کچھ وہاں سے ملے وہی کو اصلی دین سمجھو۔ کر دین میں تفقہ انہی تک محدود تھا۔ ہم عاجز بیچارے دین میں تفقہ کی اہلیت کہاں رکھ سکتے ہیں۔ یہ عقیدہ پیدا کیا اور اس کے بعد جو جی میں آیا ان ائمہ کرامؒ کے سر تھوپ دیا۔ اب دین، قائم رہ گیا ان فتاویٰ کے مجموعوں کا جو ان ائمہ کبارؒ سے نسبت رکھنے والے گروہوں نے اپنے اپنے ہاں مدون کر رکھے تھے۔ ایک اور جماعت آگے بڑھی اور اس نے کہا کہ یہ احکام

اور ان پر اس طرح کی ظاہرداری کی پابندی، سب "ہڈیوں کا ڈھیر" ہے۔ اصل دین (جو مغز تھا) وہ ان الفاظ و ارکان کے اندر چھپے ہوئے باطنی معانی میں پوشیدہ ہے اور وہ رسول اللہ سے سینہ بسینہ بطور علم لدنی مستور طریق پر آگے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ لیجئے! اب کسی دلیل و حجت اور سند و تائید کی بھی ضرورت نہ رہی اور مسلک صحیحہ یہ قرار پا گیا کہ ؎

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود، ز راہ و رسم منزلہا

یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور اس کے سائے تلے ملوکیت بڑھتی، پھولتی، پھلتی چلی آرہی تھی، حتیٰ کہ یہ عقائد و رسوم قوم کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئے اور کچھ عرصے کے بعد حالت یہ ہو گئی کہ ان رسوم و عقائد کو حق و صداقت کا مسلک ثابت کرنے کے لئے کسی کاوش و کاہش کی ضرورت ہی باقی نہ رہی اس طرح یہ تمام چیزیں جزو دین بن گئیں اور تقلیداً آگے بڑھتی چلی آئیں! اب ان کی صحت و جواز نہیں! بلکہ ان کے تقدس و عظمت کے لئے سوائے اس کے اور کسی دلیل کی ضرورت ہی باقی نہ رہی کہ یہ چیزیں ہزار برس سے امت میں متواتر چلی آرہی ہیں۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ساری کی ساری امت غلط راہوں پر چلی آرہی ہو؟ اور اس کے لئے اس قسم کی روایتیں بھی موجود ہیں کہ "میری اُمت کا سواد اعظم کبھی گمراہی پر نہیں ہو سکتا"۔

کیا اس کے بعد بھی اس سوال کا جواب آپ کے ذہن میں نہیں آسکتا کہ جب ہماری موجودہ قرآنی ہزار برس سے اسی طرح متواتر چلی آرہی ہے تو پھر یہ روش غلط کس طرح ہو سکتی ہے؟ لیکن بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جن کے ذہن میں، مذکورہ صدر تصریحات کے بعد بھی، اس کا صحیح جواب آجائے۔ اس لئے کہ، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ تقلید کا فطری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے قوائے فکریہ مفلوج اور اس کا ذہن شل ہو جاتے۔ یہ بات صرف اس کی سمجھ میں آسکتی ہے جو پہلے اس حقیقت کو، بطور ایمان، اپنے سامنے رکھ لے کہ۔

(۱) دین حق فقط کتاب اللہ کے اندر ہے۔

(۲) کتاب اللہ اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے اس لئے اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

(۳) جو کچھ اس وقت ہمیں دین کہہ کر دیا جا رہا ہے اس میں صرف وہی دین ہے جو کتاب اللہ کے مطابق ہے۔ باقی بعد کے اضافے ہیں۔ خواہ ان پر تقدس و عظمت کے کتنے ہی بڑے غلاف کیوں نہ چڑھا رکھے ہوں۔

لیکن یہ اس صورت میں ہو سکتا ہے، جب اس "ایمان" کو عام کیا جائے۔ اور چونکہ اس "ایمان" کے عام ہو جانے میں ملوکیت اور مُلائیت دونوں کی موت مضمر ہے اور ملوکیت اور ملائیت ساری دنیا کے مسلمانوں

کے اعصاب پر سوار ہے، خواہ ان کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔ اس لئے اس "ایمان" کو آج کوئی بھی عام نہیں ہونے دیگا۔ ان کی پوری کوشش یہی رہے گی کہ

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسم شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات
تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے
تا بساط زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاج خانقاہی میں اسے

۲۔ اوقاف

ایک صاحب لکھتے ہیں۔

"ہمارے بزرگوں میں سے کسی نے اپنی جائداد کا ایک حصہ اس غرض کے لئے وقف کر دیا تھا کہ اس کی آمدنی سے ایک خانقاہ (مزار) کی دیکھ بھال کا انتظام کیا جائے۔ ہم اس وقف کے متولی ہیں لیکن قبر پرستی کو شرک سمجھتے ہیں۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی کیا صورت ہو۔ کیا آپ تحریر فرمائیں گے کہ وقف کی اصلی حیثیت کیا ہے؟"

وقف کی شرعی حیثیت اہل فقہ اور اہل حدیث دونوں کے ہاں مسلّم چلی آ رہی ہے۔ وقف سے مفہوم یہ ہے کہ الوقف لا یملک ۔ ولا یباع ولا یوھب ولا یورث ۔ یعنی وقف نہ کسی کی ملکیت ہوتا ہے۔ نہ فروخت کیا جا سکتا ہے۔ نہ ہبہ کیا جا سکتا ہے اور نہ اس میں وراثت جاری ہوتی ہے، لیکن جہاں تک قرآن کا تعلق ہے، اس قسم کے وقف کی کوئی حیثیت نہیں ہے بلکہ یہ قرآن کے منشاء کے خلاف ہے۔ قرآن میں انتقالِ اموال کی جتنی شکلیں بیان ہوئی ہیں ان میں سے کہیں بھی اس قسم کے وقف کا جواز نہیں نکلتا۔ مثلاً خرید و فروخت بخشش۔ وصیت۔ وراثت۔ قرض۔ خیرات وغیرہ میں سے کوئی شکل ایسی نہیں جس میں منتقل کردہ مال دوسرے کی ملکیت میں نہ چلا جائے اور اس پر پہلے مالک کا بدستور قبضہ رہے۔ اور یہ قبضہ اس کی زندگی تک ہی محدود نہ ہو بلکہ ابد الآباد تک مسلسل چلا جائے۔ کیونکہ قبضہ کے معنی یہ ہیں کہ مال کا تصرف مالک کی مرضی کے مطابق ہو۔ اور وقف کی یہی خصوصیت ہے کہ اس میں قیامت تک مال موقوفہ واقف کی مرضی کے مطابق صرف ہوتا ہے۔ اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت وقف کا جذبۂ محرکہ، صاحب اموال و جائداد کی وہ ہوسِ اقتدار ہے جس کی بناء پر وہ دوسروں سے اپنی مرضی کے مطابق کام کراتے ہیں۔ موت کا ہاتھ اس قوت و اختیار کو ان سے چھیننا چاہتا ہے لیکن انہوں نے اس کی بقا کی یہ شکل پیدا کر لی ہے کہ وہ اپنی جائداد کو وقف کر جائیں اور اس طرح قیامت تک ان کی مرضی و منشاء جاری و ساری رہے۔ یہاں یہ کہا جائے گا کہ

وقف عام طور پر "نیک کاموں" کے لئے کیا جاتا ہے اس لئے اوقاف تو قوم کا مستقل سرمایہ ہوتے ہیں۔ لیکن ذرا سوچئے کہ قوم کے کام تو وہی سرمایہ آسکتا ہے جو قوم کی ضرورت کے وقت کام آسکے۔ اور قوموں کی ضرورتیں صبح و شام بدلتی رہتی ہیں۔ مستقبل کی ضروریات کا تعین مُردوں کے سپرد کر دینا، قوم کو ماضی کی زنجیروں کے ساتھ باندھ دینا ہے۔ جو مر چکا ہے اسے کیا علم کہ قوم کو آج کس چیز کی ضرورت ہے۔ وہ قوم کے سرمایہ (یعنی جائداد موقوفہ) کو جامد (Freeze) کر کے رکھ دیتا ہے۔ غور کیجئے کہ اگر تمام صاحب جائداد اپنی اپنی جائداد کو مخصوص مقاصد کے لئے وقف کرتے جائیں تو کچھ عرصہ کے بعد، قوم، ان مخصوص مقاصد کے علاوہ باقی امور کے لئے پائی پائی کی محتاج ہو جائے۔ "نیک کام" وہ ہے جو دنیا میں خدا کا قانون رائج کرنے والی جماعت کی تقویت کا موجب ہو۔ اس تقویت کے لئے اسباب و ذرائع، آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ بحالتِ امن اس تقویت کا راز کسی اور چیز میں ہوتا ہے اور بحالتِ جنگ اس کے تقاضے کچھ اور ہو جاتے ہیں۔ وقس علیٰ ہٰذا۔ اس لئے اگر ہر صاحب جائداد، قومی سرمایہ کو ان مقاصد کے ساتھ وابستہ کرتا جائے جنہیں وہ اپنی دانست اور اپنے زمانہ میں "نیک کام" سمجھتا تھا، تو اس سے قوم محتاج سے محتاج تر ہوتی جائے گی۔

کہا جاتا ہے کہ جب ایک شخص اپنے مال میں وصیت کر سکتا ہے تو وقف بھی تو وصیت ہی کی ایک شکل ہے۔ لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ وصیت میں، موصی کے مرنے کے بعد، جس کے حق میں وصیت کی گئی ہو وہ اس مال کا مالک بن جاتا ہے اور اسے اپنی منشاء کے مطابق تصرف میں لا سکتا ہے۔ برعکس اس کے وقف میں متولی کو اس مال میں کسی قسم کے تصرف کا اختیار نہیں ہوتا۔ اسے وصیت کرنے والے کی مرضی کے مطابق صرف کرتے رہنا ہوتا ہے۔

لہٰذا قرآن کی رو سے وقف کا کوئی جواز نہیں نکلتا۔ اگر کوئی شخص اپنے مال کو "نیک کاموں" میں صرف کرنا چاہتا ہے تو اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ وہ مال، بروئے وصیت ملت کے نظامِ اجتماعی کے سپرد کر جائے کہ وہ جس طرح مناسب سمجھیں اسے استعمال میں لے آئیں۔ یعنی ضروریات کا تعین زندوں کے سپرد ہو نہ کہ مُردوں کے اختیار میں۔

لیکن جس قوم نے "خدائی اختیارات" کو بھی مردوں کے ہاتھ میں دے رکھا ہو وہ انسانی اختیارات کو ان کے ہاتھ سے چھیننے پر آمادہ کیوں ہونے لگی؟

۳۔ ماں باپ کی اطاعت

ایک نوجوان رقمطراز ہے۔ میرے ماں باپ نے میری شادی اپنی مرضی کے مطابق کی۔ اب وہ میری بیوی سے ناراض ہیں اور مجھے مجبور کرتے ہیں کہ میں اسے طلاق

دیدوں یا اس سے ناروا سلوک کروں۔ حالانکہ میری بیوی سے میرے تعلقات بہت خوشگوار ہیں۔ میں اس پر آمادہ نہیں ہوتا تو وہ مجھے کہتے ہیں کہ تو ماں باپ کا فرمانبردار نہیں اس لئے تو خدا کے عذاب میں ماخوذ ہو جائے گا۔ براہِ کرم مطلع فرمایئے کہ قرآن کی رو سے اس باب میں کیا حکم ہے "

انسان کی حالت یہ ہے کہ خود ہی پتھر کے نیچے اپنا ہاتھ دے لیتا ہے اور پھر خود ہی چلاتا ہے۔ قرآن نے ماں باپ کے ساتھ حُسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انہوں نے تمہاری اُس وقت پرورش کی تھی جب تم دوسروں کے محتاج تھے۔ اب یہ کبرسنی کی وجہ سے تمہارے محتاج ہیں اس لئے تم ان کی پرورش کرو۔ بڑھاپے کی وجہ سے ان کا مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے لیکن تم انہیں جھڑکو نہیں۔ بلکہ ان سے نرمی سے پیش آؤ۔ بس یہ ہے ماں باپ کے متعلق قرآن کا ارشاد۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ قرآن، جو ہر نئی نسل کو آزاد پیدا کرتا ہے اور انہیں اختیار دیتا ہے کہ وہ اپنے لئے، اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق، آپ راہیں تلاش کرے اور اپنے مقدرات کے ستارے خود تراشے، وہ ان ابھرنے اور بڑھنے والی نسلوں کو ان کے فیصلوں کا تبع قرار دے گا جن کا زمانہ گزر چکا ہے ؟ قرآن، جو انسان کو حریت فکر و عمل کا درس دینے کے لئے آیا ہے؟ انسان کو کبھی گزشتے ہوئے زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ وابستہ نہیں کرتا۔ اس نے خود کہا ہے کہ عمر کی زیادتی سے انسان کی عقل منکوس (اوندھی) ہو جاتی ہے۔ کیا وہ یہ حکم دے گا کہ صحیح الدماغ نوجوان، ان کے فیصلوں کے مطابق چلے جن کی عقل اوندھی ہو چکی ہے ؟ یقیناً یہ قرآن کے متعلق بڑا غلط اندازہ ہے۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اگر قرآنی تعلیم کا اسی ایک مسئلہ میں باقی ادیان اور مذاہب اخلاق سے مقابلہ کیا جائے تو صاف نظر آ جائے گا کہ قرآنی تعلیم کس قدر فطرت انسانی کے مطابق اور ارتقائے آدمیت کے لئے مؤید ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب اور اخلاق کے تمام دبستانوں میں یہ چیز ایک مسئلہ کی حیثیت اختیار کئے ہوئے ہے کہ "ماں باپ کی اطاعت فرض ہے" ایسے مسئلہ کی حیثیت جو کسی غور و فکر یا تنقید و تبصرہ کا محتاج ہی نہیں۔ ان کے ہاں کبھی کسی نے اتنا خیال کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی کہ یہ بھی کوئی ایسی بات ہے جس میں دو رائیں ہو سکتی ہیں! لیکن قرآن کو دیکھئے کہ اس نے دنیا میں پہلی مرتبہ یہ آواز بلند کی ہے کہ جو عقل کے انحطاط کے دور میں پہنچ چکے ہوں ان کے فیصلے درخورِ اعتنا نہیں ہوا کرتے۔ ماں باپ حسن سلوک اور نرم برتاؤ کے مستحق ہیں اور بس! جب تک بچہ، بچہ ہے، وہ اس کے نگران و کفیل ہیں۔ جب وہ عقل کی پختگی کو پہنچ جاتا ہے تو اپنے لئے آپ فیصلے کرنے کا مجاز ہو جاتا ہے۔ وہ دوسروں کے تجربوں سے مشورۃً فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ لیکن اسے ان کے فیصلوں کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ وہ وحی کی حدود کے اندر، نظامِ ملت کے متعین کردہ طرق و اسالیب کی ہم آہنگی میں اپنے لئے آپ فیصلے کرے گا۔

یہی قرآن کی تعلیم! لیکن جب ملوکیت کے استبداد نے انسانی حریت و آزادی کا گلا گھونٹا ہے تو ہر "زیردست" کو "بالادست" کے فیصلوں کا پابند قرار دیدیا گیا۔ سیاسی زندگی میں بادشاہ کے فیصلوں کا۔ "روحانی زندگی" میں احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کے فیصلوں کا، اور معاشرتی زندگی میں بزرگوں کے فیصلے کا۔ اب اگر ایک طرف یہ تعلیم بطور اخلاقی اساس، انسانوں کے رگ و پے میں پیوست کردی گئی کہ

اگر شہ روز را گوید شب است ایں　　　　بباید گفت اینک ماہ و پروین

تو دوسری طرف اُن کی گھٹی میں یہ چیز بھی ڈال دی گئی کہ

خطائے بزرگاں گرفتن خطا است

یہی وہ دور تھا جب ماں باپ نے بھی اپنی "بزرگی" سے فائدہ اٹھایا اور یہ عقیدہ عام کردیا کہ "ماں باپ کی اطاعت فرض ہے" یعنی جب تک ماں باپ زندہ ہیں، ان کا لڑکا خواہ تھا تو ستر برس کا بھی کیوں نہ ہو جائے، اسے کوئی حق حاصل نہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے اپنی صوابدید کے مطابق کرلے۔ اسے ان کے فیصلوں کی تعمیل کرنی ہوگی جن کی عقل کے متعلق اس کے خدا کا فیصلہ ہے کہ وہ اس عمر میں اوندھی ہو جاتی ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ماں باپ کی اطاعت کو فرض سمجھنے والے، ساری عمر عقلی طور پر اپاہج اور ذہنی طور پر بچے کے بچے رہ جاتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہماری موجودہ معاشرت (جس میں خاندانوں میں مشترکہ زندگی بسر ہوتی ہے) کا تقاضا یہ ہے کہ افراد خاندان متفقہ فیصلوں کے ماتحت زندگی کی منازل طے کریں۔ اور خود سر اور سرکش نہ بن جائیں۔ لیکن خودسری اور سرکشی اور شے ہے اور اصابت رائے اور شے۔ عائلی زندگی کے فیصلے باہمی مشاورت سے ہونے چاہئیں اور مشاورت میں کوئی کسی دوسرے کے فیصلے کا مطیع نہیں ہوا کرتا۔ ماں باپ کی اطاعت کو فرض مان لیا جائے تو اس میں مشاورت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کا فیصلہ غلط ہو یا صحیح، اس کی اطاعت فریضۂ خداوندی کی حیثیت سے واجب ہوگی۔ اور یہ یکسر قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔

آپ غور کیجئے کہ قرآن ہمیں کہاں لے جانا چاہتا ہے اور ہم اپنے وضع کردہ یا دوسروں سے مستعار اخلاق اور تصورات نیکوکاری کے ماتحت کہاں جاچکے ہیں۔ اور کدھر چلے جارہے ہیں۔ اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم تمام غیر قرآنی تصورات حیات سے کٹ کر، ایک مرتبہ پھر خالص قرآنی نظریۂ زندگی سے اپنے آپ کو پیوستہ کرلیں۔

وگر بہ شاخ گل آویزد آب و نم درکش
پریدہ رنگ ز باد صبا چہ می جوئی؟

انسانی حیاتِ اجتماعیہ میں تصورِ حکومت کا موقف

(حمید زماں صاحب صدیقی، ہری پور ہزارہ)

اسلام میں حکومت و سلطنت کا تصور حیاتِ انسانی کے دیگر شعبوں سے الگ نہیں ہے بلکہ ایک ایسے کل کا جزو ہے جس کے تمام اجزاء باہم مربوط اور منظم ہیں اور اس کل کی کسی ایک جزو کی نفی سے قریب قریب وہی نتائج مرتب ہوتے ہیں جو پورے کل کی نفی سے ہو سکتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی اسلام میں اہمیت و اولیت کے اعتبار سے ان اجزاء میں تفاوت ہے یعنی کچھ اجزاء کو اولیت کا درجہ حاصل ہے اور کچھ دوسرے اجزاء ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر اقوام دنیا ہمیشہ سے جس غلطی میں مبتلا رہی ہیں وہ یہ ہے کہ انھوں نے زندگی کے اس اہم اصل الاصول کا کبھی لحاظ نہیں کیا اور اکثر غیر ضروری چیز کو ضروری تصور کر لیا اور ضروری چیز کو پیچھے ڈال دیا۔ چنانچہ یہی وہ قدیم گمراہی ہے جو تاریخ کے ہر دور میں اقوام و ملل کی تباہی کا باعث بنتی رہی ہے۔

مرشد رومی حکیم پاک زاد　　　سرِ مرگِ انسان بر ما کشاد
ہر ہلاکِ امت پیشیں کہ بود　　　زانکہ بر جندل گمان بردند عود
(اقبال)

انسان کی حیاتِ اجتماعیہ میں حکومت و سیاست کا مقام کیا ہے؟

یہ مسئلہ انسانی مسائل میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ انسانی عقل نے اس مسئلہ میں کبھی صحیح راہ اختیار نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے پیچیدہ مسائل آج تک کبھی سلجھ نہیں سکے، بلکہ پہلے سے پیچیدہ تر ہو رہے ہیں۔

حکومت و سیاست کے مسئلہ میں دو متضاد نظریے شروع سے چلے آتے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ سیاست مذہب اور دین کا ایک جزو ہے اور اس کو زندگی کے دوسرے عناصر سے وہی نسبت ہے جو کل کے کسی ایک جزو کو دوسرے اجزاء سے ہوتی ہے اور دین کل کی حیثیت سے ان عناصر پر حاوی ہے۔ یہ نظریہ دینی نظریہ سیاست کے نام سے موسوم ہے۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ سیاست و حکومت کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے، سیاست الگ چیز ہے اور مذہب الگ! اس نظریہ کو لادینی نظریہ سیاست کہا جاتا ہے۔ یہ دونوں نظریے فکر و عمل کے تمام مراتب و مدارج میں باہم تضاد رکھتے ہیں اور ابتداء سے انتہا تک کسی ایک مرحلہ پر بھی ان کا

اتحاد ممکن نہیں ہے۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دو نظریوں میں سے کونسا نظریہ انسانیت کو نجات و کامرانی سے ہمکنار کر سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب فکر و استدلال سے زیادہ عمل ہی دے سکتا ہے لیکن چونکہ آج اقوام دنیا کا رجحان دینی نظریہ سیاست سے ہٹ چکا ہے اور ان کے خیال میں جدید تصورات حکومت ہی زمانہ کے نئے تقاضوں کو پورا کر سکتے ہیں اس لئے افہام کی غرض سے کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔

حکومت کا مقصد

دنیا کے تمام عقلمند انسانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حکومت کا مقصد خیر و فساد کا استیصال، انسانوں کے ہوس پرستانہ اور ہیجانی جذبات کو قانون کے ذریعہ دبانا اور مملکت میں امن قائم کرنا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس وقت تک جتنے نظریہ ہائے سیاست معرض وجود میں آچکے ہیں خواہ وہ اجتماعیت کے اصول پر مبنی ہیں یا انفرادی اور شخصی آزادی کے حامل ہیں ان کے پس پردہ یہی جذبہ کارفرما ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ نظریئے انسانوں کی محدود اور کوتاہ بین عقل کی پیداوار ہیں اور آج تک کسی انسانی نظریہ سیاست نے حکومت و سلطنت کو وہ مقام و موقف عطا نہیں کیا جو انسانی معاشرہ میں اسے حاصل ہونا چاہئے تھا۔ مگر جہاں تک ان تصورات کے فکری پس منظر (بیک گراؤنڈ) کا تعلق ہے بلاشبہ ان میں عمومی اصلاح کی خواہش موجود ہے۔
چنانچہ اسی مقصد کے پیش نظر سیاسیین کے ایک گروہ نے حکومت و سلطنت کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ وہ حکومت ہی کو انسانی زندگی کی غایت تصور کرتے ہیں، یعنی ان کے نزدیک حکومت ہی مقصود بالذات ہے۔ چنانچہ قدیم یونانی فلاسفہ کا فلسفہ سیاست (پولٹیکل فلاسفی) اسی اصل پر مبنی تھا اور متاخر مفکرین میں سے سترہویں صدی کے مشہور مفکر ہابس اور جرمنی کے شہرہ آفاق فلسفی ہیگل نے حکومت کی بنیاد فلسفۂ اجتماعیت پر رکھی تھی۔

دوسرا گروہ انفرادیت اور شخصی آزادی پر زور دیتا ہے۔ چنانچہ فرانس کا مایۂ ناز مفکر روسو انفرادیت اور شخصی آزادی کا زبردست داعی تھا اور ساتھ ہی حکومت کی قدر و منزلت کا بھی قائل تھا۔ ان دونوں مقاصد کے حصول کے لئے اس نے معاہدۂ عمرانی کا نظریہ پیش کیا تھا۔ اس کے نزدیک حکومت و اقتدار کا اصل منبع عوام ہیں اور ہیئت حاکمہ عوام کے سامنے جوابدہ ہے۔ کارل مارکس کا نظریۂ اشتراکیت (کمیونزم) بھی روسو کے فلسفۂ سیاست سے متاثر ہے۔

اسلامی مفکرین میں علامہ ابوالبقا جو گیارہویں صدی ہجری کے مستند شارح قانون ہو گذرے ہیں حکومت کی تعریف ذیل کے الفاظ میں کرتے ہیں: حکم اور امتناع (امر و نہی) کے اعتبار سے ایسا تصرف جس کا مقصد عوامی اصلاح ہو۔

اسی طرح دنیائے اسلام کے مشہور و معروف مفکرین ابنِ خلدون، علامہ ابوالحسن ماوردی، امام راغب اصفہانی اور امام ولی اللہؒ جنھوں نے اجتماعی سیاسیات کو موضوعِ بحث بنایا ہے حکومت کا یہی مقصد قرار دیتے ہیں۔ غرض ان تمام مفکرین کے سیاسی نقطہ ہائے نظر میں خواہ کتنا ہی اختلاف ہے مگر ایک چیز میں سب متفق ہیں اور وہ یہ ہے کہ حکومت کا مقصد عوام اور مملکت کی خدمت اور قیامِ امن ہے۔ اس تمہید کے بعد ہم اس بات کی طرف رجوع کرتے ہیں کہ مذکورہ مقاصد کے لحاظ سے دینی نظریۂ سیاست کارآمد ہے یا لادینی تصورِ حکومت! سطورِ بالا میں عرض کیا جا چکا ہے کہ انسانی نظریۂ سیاست کسی محکم اور پائدار اساس پر مبنی نہیں ہے اور عقلی آرارِ سیاسیہ کے لحاظ سے انسان کی حیاتِ اجتماعیہ میں حکومت کو وہ درجہ حاصل نہیں ہو جو اس کو حاصل ہونا چاہئے۔ کیونکہ ان کے نزدیک نظمِ حکومت یا افراد کی حریت و آزادی ہی مقصود بالذات ہے اور کوئی ایسا جامع نصب العین ان کے سامنے نہیں ہے جو اجزارِ حیات میں ربط و نظم پیدا کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں حکومت و سیاست حیاتِ انسانی کے دیگر اجزار سے بالکل بے تعلق ہوگئی ہے اور زندگی کے دوسرے شعبے اقتدارِ حکومت سے آزاد ہوگئے ہیں۔ حالانکہ حیاتِ انسانی کے تمام اجزار (مادی اور روحانی) کو قدرتی نظم و ترتیب کے ساتھ قائم رکھنا چاہئے تھا۔

دینی تصورِ سیاست

دینی نظریۂ سیاست کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نہ تو حکومت مقصود بالذات ہے اور نہ ہی افرادِ مملکت کی حریت و آزادی اس کی غایت و انتہا ہے۔ بلکہ وہ حکومت و سیاست کو مجموعۂ زندگی سے وابستہ رکھنا چاہتا ہے یعنی زندگی ایک کل ہے اور تمام اجزار باہم مربوط اور منظم ہیں اور پوری زندگی کی اصلاح اسی وقت ممکن ہے کہ اس کے اجزار کے ربط و ترتیب کو کما حقہ ملحوظ رکھا جائے اور اس غرض کے لئے ایک ایسے نظامِ حیات کی ضرورت ہے جو پوری زندگی پر حاوی ہو اور حیاتِ انسانی کا کوئی زاویہ اس کی گرفت سے باہر نہ ہو نیز اس میں یہ خصوصیت ہو کہ مجموعۂ زندگی کی اجزائی ترتیب کو برقرار رکھ سکے، یعنی ہر جزو کو وہی جگہ عطا کرے جس کا وہ مستحق ہے۔ کسی ایک جزو کو ضرورت سے زیادہ اہمیت نہ دے اور نہ ہی کسی ضروری جزو کی اہمیت کو کم کرے۔ ایسا نظامِ حیات اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ خدائی نظامِ حیات (دین) ہے۔

اسلام حکومت کی قدر و منزلت کا منکر نہیں ہے اور نہ ہی افرادِ مملکت کی حریتِ فکر، حریتِ معیشت اور مساواتِ عمومی کو نظر انداز کرتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں اپنی اپنی جگہ کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ مگر انسانی زندگی کی غایت الغایات ایک بلند تر اور مقدس ترین نصب العین ہے جو تمام اجزارِ حیات میں جاری و ساری ہے۔ یہ نصب العین انسانی کثرت کو ایک اعتقادی وحدت میں تبدیل کرنا ہے جس سے دنیا کا ہر انسان سعادتِ ابدی اور عیشِ مسلسل کا مستحق بن سکے۔ یہ معصوم اور مقدس الہیاتی تصور اسلامی تصور

اجتماع و سیاست کی روح ہے۔ اور حکومت اسی نصب العین کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ اور چونکہ اسلام میں اقتدار حکومت ایمان باللہ اور تصور احتساب پر مبنی ہے اس لئے اس کے اصول و نظریات اور اعمال میں لامحالہ یکانگت ہوتی ہے یعنی ایک مسلم حکومت کو صرف اس بات ہی کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ عوام کے سامنے جوابدہ ہے بلکہ اس سے بہت زیادہ اس کو ایک غیر محسوس اور قادر علی الاطلاق ہستی کا خوف ہر لحظہ دامنگیر رہتا ہے۔ اس لئے حکومت اسلامی کو ہر حالت میں اسلام کے قوانین عدل اور اصول مساوات کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ مگر دنیاوی اور عقلی حکومتوں کو زیادہ سے زیادہ کوئی چیز ادائے فرض کا احساس دلانے والی ہے تو وہ عوام کی بازپرس کا احساس ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسری طاقت ایسی نہیں ہے جو اہل حکومت کو حکومتی فرائض کے ادا کرنے پر مجبور کرے۔ آج جو حکومتیں پارلیمانی دستور اور جمہوری نظام (ڈیموکریسی) کے تحت کام کر رہی ہیں دنیا جانتی ہے کہ ان میں عوام کو کس طرح بے وقوف بنایا جاتا ہے؟ ملک کی ایک پارٹی بلند بانگ دعاوی کے ساتھ میدان سیاست میں اترتی ہے اور عوام کو اپنے اصلاحی پروگرام سے روشناس کراتی ہے۔ مگر کون نہیں جانتا کہ ان کے دل اور زبان میں کبھی مطابقت نہیں ہوسکی اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اس پر وہ کبھی عمل نہیں کرسکے۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ قول اور عمل میں مطابقت پیدا کرنے والی اگر کوئی چیز ہے تو وہ مذہب و روحانیت ہے۔ اور موجودہ نظریہ ہائے سیاست اس دولت لازوال سے قطعی محروم ہیں۔

یعلمون ظاھرًا من الحیوۃ الدنیا وھم عن الاخرۃ غافلون۔ ( )

وہ صرف حیات دنیوی کے ظاہری خط و خال کو دیکھتے ہیں اور وہ آخرت سے بالکل غافل ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ موجودہ مغربی جمہوریت اگرچہ بظاہر زرق برق اور خوشنما لباس میں ملبوس نظر آتی ہے مگر اس کا باطن چنگیزیت سے تاریک تر ہے۔

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر

ریاست شرعیہ کے بنیادی مقاصد

گذشتہ سطور میں بتایا جاچکا ہے کہ موجودہ نظام ہائے سیاست بھی خاص قسم کے مقاصد لے کر عالم وجود میں آئے ہیں اور ان میں سے ہر ایک نظام خواہ وہ آمریت ہو یا ملوکیت، موجودہ مغربی جمہوریت ہو یا اشتراکیت اپنا ایک مستقل فلسفہ رکھتا ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے ان اقوام کے فلسفہ ہائے سیاست اور مقاصد حکومت بھی شرمندہ معنی نہیں ہوسکے کیونکہ وہ کسی ایسی بالادست طاقت پر ایمان نہیں رکھتیں جو ان کی غلط کاریوں پر مواخذہ کرنے والی اور ان کے اعمال حکومت کا محاسبہ کرنے والی ہے اور نہ ہی

یوم الحساب کو تسلیم کرتی ہیں اس کے برعکس اسلامی نظام سیاست و اجتماع کی بنیاد مسئولیت عامہ کے تصور پر ہے

ولنسئلن الذین ارسل الیھم ولنسئلن المرسلین ۔ (آیۃ)

ہم ان لوگوں سے جن کی طرف رسول بھیجے گئے ہیں اور خود رسولوں سے بھی باز پرس کریں گے ۔

اس لئے حکومت اسلامی کے مقاصد اور موجودہ نظام ہائے سیاست کے مقاصد میں بین فرق یہ ہے کہ مسلمان کا ایمان باللہ اور ایمان بالآخرہ اسلامی مقاصد کو بروئے کار لانے کا ضامن رہے مگر لادینی نظامات کے پس پردہ کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو ان کے مقاصد کو درجۂ فعلیت میں لانے کی ضمانت دے سکے۔ حکومت اسلامی کے بنیادی مقاصد حسب ذیل ہیں ۔

قیام عدل ۔ دفع فساد اور قیام امن ۔ افراد مملکت کو حریت فکر اور مجلسی، قانونی، معاشی، اور سیاسی مساوات عطا کرنا ۔ ان سہ گانہ مقاصد کو اگر ایک ہی جامع مقصد میں سمیٹنا چاہیں تو وہ یہ ہے کہ انسانوں کو غیر فطری رجحانات سے ہٹا کر فطرۃ اللہ یا نقطۂ عدل پر کھڑا کرنا ۔

ولقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط (حدید)

ہم نے اپنے رسول آیات بینات کے ساتھ بھیجے اور ان کے ہمراہ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ نقطۂ عدل پر کھڑے ہو جائیں ۔

یا یہ کہ خود نیک بننا اور دوسروں کو نیک بنانا ۔

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر (الحج)

اور وہ جن کو ہم اگر زمین میں غلبہ و تمکنت عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، لوگوں کو نیکی کا حکم دیں گے اور ان کو برائی سے منع کریں گے ۔

یعنی خلافت اسلامیہ صرف دنیاوی اصلاح ہی کی ضامن نہیں ہے بلکہ یہ دنیا اور آخرت دونوں پر نظر رکھتی ہے ۔ چنانچہ ابن خلدون اس حقیقت کو ذیل کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں :-

الخلافۃ نیابۃ فی حفظ الدین وسیاسۃ الدنیا

خلافت شرعیہ محافظت دین اور انتظام دنیا دونوں میں نیابت کے فرائض انجام دیتی ہے ۔

اور صاحب شرح مواقف اسی مفہوم کو یوں ظاہر کرتے ہیں :-

الامامۃ سیاسۃ عامۃ فی امور الدین والدنیا ۔

امامت ریاست عامہ ہے جو دین اور دنیا دونوں کا لحاظ کرتی ہے ۔

تفصیل مقاصدِ عدل

عدل اپنے متعارف مفہوم کے لحاظ سے انصاف اور داد خواہی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس کے اصل معنی برابری کے ہیں اور اس مفہوم کے اعتبار سے یہ حکومت کے تمام فرائض پر حاوی ہے۔ یعنی مملکت کے متفاوت طبقات اور متضاد رجحانات میں اس طرح توازن قائم کرنا کہ ظلم و ناانصافی، بددیانتی، رشوت ستانی، فسق و معصیت اور نامساوات کا خاتمہ ہو جائے اور چونکہ حکومت اسلامیہ کا اہم مقصد قیام عدل ہے اسلئے قرآن حکیم نے بار بار اس کی تاکید کی ہے۔

واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل (آیۃ)

اور جب تم لوگوں میں فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔

ان اللہ یامرکم بالعدل والاحسان (آیۃ)

بیشک اللہ تعالیٰ تم کو عدل و احسان کا حکم دیتا ہے۔

اور عجیب تر بات یہ ہے کہ دشمن کے نامنصفانہ اور ظالمانہ طرزِ عمل کے مقابلہ میں بھی قرآن کریم اپنے پیروؤں کو طریقِ عدل سے انحراف کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

ولا یجرمنکم شنآن قوم علی ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی (المائدہ)

کسی قوم کے خلاف جذبۂ انتقام تم کو ناانصافی پر آمادہ نہ کرے تم عدل کرو کہ یہ تقویٰ کو قریب تر کرے

دفع فساد اور قیام امن

صرف اندرونِ مملکت ہی سے نہیں بلکہ خدا کی ساری زمین سے ظلم و معصیت اور فساد و بدامنی کو ختم کرنا حکومتِ اسلامی کا فریضۂ ملی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ قیامِ حکومت اور جہاد کا وجود اسی مقصد کے لئے ہے۔

قاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ۔ (الانفال)

تم اہلِ کفر سے اس وقت تک لڑو کہ فتنہ مٹ جائے اور طاعت اللہ کیلئے مخصوص ہو جائے۔

یا ایھا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ ولو علی انفسکم او الوالدین والاقربین (النساء)

اے ایمان والو! تم پوری قوت سے عدل قائم کرنے والے اور اللہ کے لئے گواہ بن جاؤ۔ اگرچہ (یہ گواہی) خود تمہارے ہی خلاف ہو یا والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف ہو۔

ولولا دفع اللہ الناس بعضھم ببعض لفسدت السموات والارض (الآیۃ)

اگر اللہ تعالیٰ صالح لوگوں کے ذریعہ شریر اور مفسد لوگوں کو دفع نہ کرتا تو زمین اور آسمان کا نظام فاسد ہو جاتا۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر (البقرہ)

تم بہترین امت ہو جس کو لوگوں کی فلاح کے لئے پیدا کیا گیا ہے (تمہارا فرض منصبی یہ ہے) کہ تم لوگوں کو نیکی کی دعوت دو اور برائی سے روکو۔

اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ملتِ اسلامیہ اور ریاستِ شرعیہ کا سب سے بڑا مقصد رفعِ ظلم، قطعِ فساد اور قیامِ امن ہے اور احادیثِ نبوی میں بھی اس حقیقت کو واشگاف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

عن ابی بکرؓ انی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان الناس اذا راؤ الظالم فلم یاخذ وا علی یدیہ اوشک ان یعمھم اللہ بعقاب منہ (اخرجہ الترمذی)

لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اسکو ظلم کرنے سے منع نہ کریں تو ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کو عذاب میں مبتلا کر دے۔

من رایٰ منکم منکراً فلیغیرہ بیدہٖ ومن لم یستطع فبلسانہٖ ومن لم یستطع فبقلبہٖ وذالک اضعف الایمان۔ (ترمذی)

تم میں سے جو شخص برائی دیکھے تو اسکو قوت سے مٹائے اور جو اس کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ زبان سے روکنے کی کوشش کرے اور جو اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو وہ دل ہی سے برا سمجھے اور یہ کمزور ترین درجہ ایمان ہے۔

ان اللہ لا یعذب العامۃ بعمل خاصۃ حتی یروا المنکر بین ظھرانیھم وھم قادرون علی ان ینکروہ فاذا فعلوا ذالک عذب اللہ الخاصۃ والعامۃ (رواہ احمد)

اللہ تعالیٰ چند لوگوں کے اعمالِ بد کی وجہ سے عامۃ الناس کو عذاب میں نہیں ڈالتا مگر اس وقت جبکہ وہ اپنے سامنے برائی کو دیکھیں اور وہ اس کے خلاف اعلانِ نفرت پر قادر ہوں مگر ایسا نہ کریں تو اللہ تعالیٰ ان چند شریر لوگوں کے ساتھ عام لوگوں کو بھی مبتلائے عذاب کرتا ہے۔

حریتِ فکر اور مساواتِ عامہ

اس بات کا انکار حقیقت نفس الامری کا انکار ہے کہ اسلام اپنی مملکت میں مسلم اور غیر مسلم کو ہر قسم کی شہری، مجلسی، معاشی اور ثقافتی حریت و آزادی عطا کرتا ہے۔ نیز وہ غریب و امیر، بندہ و آقا، حاکم و محکوم اور ذات و نسل کی کسی تفریق کو برداشت نہیں کرتا۔ چنانچہ اسلام کی سیاست عادلہ اور قوانینِ عدالت کی نظر میں امیر المومنین اور معمولی سے معمولی شہری کی مجلسی اور قانونی حیثیت برابر ہے۔

یہ مستقل موضوع ہے اور ہم آئندہ کسی موقع پر اس پر تفصیلی تبصرہ کریں گے۔

اپنی آنکھ اور قرآن کریم کی روشنی

پرویز

کسی نئی زبان کے سیکھنے میں کس قدر محنت درکار ہوتی ہے! لیکن انسان کے بچہ کو دیکھئے کہ وہ ان دشوار گزار مراحل کو کس آسانی سے طے کر لیتا ہے۔ بچہ جب بولنے کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس طرح بلا تکلف باتیں شروع کر دیتا ہے گویا یہ سب کچھ اسے پہلے ہی سے یاد تھا۔ لیکن بچہ وہی زبان بولتا ہے جو اس کے گرد و پیش بولی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ اسے پہلے ہی سے یاد نہ تھا بلکہ اس نے اپنے گہوارہ میں خاموش نگاہوں سے سب کچھ سیکھ لیا تھا اور سیکھا اس پختگی سے کہ نہ صرف الفاظ ہی ازبر ہو گئے بلکہ اس لب و لہجہ کی بھی پوری پوری نقل کر لی جو اس کے ماحول کی فضا کو متحرک کر رہا تھا۔ اور نقل بھی ایسی مکمل کہ دو لفظ بولنے سے معلوم ہو جائے کہ بچہ کس خطہ اور کس قبیلہ سے متعلق ہے۔ بڑی عمر میں پہنچ کر جو زبان سیکھی جائے اس میں اہل زبان کا سا لب و لہجہ پیدا کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے اور ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ یہ پہچانا ہی نہ جا سکے کہ اس کی وہ زبان مادری ہے یا بعد میں سیکھی ہوئی۔ لیکن بچہ اس نقل کرنے میں کمال کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ بچے کا ذہن کس قدر اخاذ ہوتا ہے اور وہ نقوش جو بچپنے ہی میں اس نے لوح قلب و دماغ پر آغوش مادر میں منقش ہو جاتے ہیں اور کیسے انمٹ اور دیرپا ہوتے ہیں لیکن کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بچے کے دماغ کی یہ اخاذی اور اثر قبولی صرف زبان تک ہی محدود ہے! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ دماغ تو بہر حال دماغ ہے۔ جب وہ حروف و الفاظ اور لب و لہجہ کی حرکات و سکنات سے ایسا متاثر ہوتا ہے تو گرد و پیش کے دیگر احوال و کوائف سے اثر پذیر کیوں نہ ہوگا! زبان کی اثر پذیری چونکہ الفاظ کے محسوس پیکر میں ہمارے سامنے آجاتی ہے اس لئے ہم اسے ناپ جوکھ لیتے ہیں۔ لیکن خیالات کی اثر پذیری چونکہ بچے کے قلب و دماغ پر غیر محسوس طور پر پرورش پاتی ہے اس لئے ہم اس کا احساس نہیں کرتے۔ کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ جنہوں نے کرنا چاہا انہوں نے ان غیر محسوس خیالات کو بھی ناپ اور تول کر دیکھ لیا۔ علم تجزیۂ نفس کی بنیاد ہی اس اصول پر ہے۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کا بچہ اپنے وراثتی اور ماحولی اثرات کا پیکر ہوتا ہے۔ اور یہی نقوش و اثرات آہستہ آہستہ وہ محکم چٹانیں بن جاتے ہیں جن پر اس کے نظریاتِ زندگی اور معتقداتِ حیات کی ثریا بوس عمارتیں قائم ہو جاتی ہیں۔ یہ اثرات جب توارث

و تواتر سے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے چلے آئیں تو ان کی ابتدا کتنی ہی غلط نہج پر کیوں نہ ہوئی ہو رفتہ رفتہ اس قوم کے لئے یہی صداقت و حقیقت کا معیار بن جاتے ہیں۔ اس قوم کے فرد انتہائی خوش عقیدگی سے دل کے نازک ترین گوشوں میں چھپائے، سینے سے لگائے لگائے پھرتے ہیں اور یہ غلط نظریات اُن کے نزدیک ایسی گراں بہا متاع کی شکل اختیار کر جاتے ہیں کہ ان کا چھوڑنا تو ایک طرف، چھوڑنے کے تصور تک سے وہ اس طرح کانپ اٹھتے ہیں گویا اُن کی کائنات لٹی جا رہی ہے۔ غلط نظریات و معتقدات کے یہ حسین و نظر فریب پردے اتنے دبیز ہوتے ہیں کہ فطرتِ صحیحہ ان کے نیچے دب جاتی ہے اور آہستہ آہستہ اس کا گلا اس طرح گھٹ جاتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کہیں زندہ بھی ہے یا نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان پردوں کو کون اٹھائے؟ اس خاص ماحول میں تو کم و بیش ہر ایک ان وراثتی اثرات سے متاثر ہوتا ہے۔ مبدأ فطرت کی کرم گستری نے یہ انتظام اپنے ذمہ لیا کہ وقتاً فوقتاً ایسے پیغامات اس کی طرف سے آتے رہیں جو وراثت و ماحول کے تمام اثرات سے محفوظ و غیر متاثر اور انسان کی فطرتِ صحیحہ کے عین مطابق و موافق ہوں۔ دنیا میں سلسلۂ وحی و رسالت کی یہی لِم اور انتظام رشد و ہدایت کی یہی غایت ہے۔ یعنی انسان کی فطرتِ صحیحہ وراثت اور ماحول کے اثرات سے مسخ ہو جاتی ہے اور پیغامِ خداوندی ان غیر فطری اثرات کو دور کرنے کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ سعید روحیں فطرت سے ہم آہنگ پیغام کو جانی پہچانی ہوئی (معروف) آواز سمجھ کر اسے قبول کر لیتی ہیں۔ سرکش و متمرد انسان اپنے وراثتی معتقدات کو ایسا محکم اور یقینی خیال کر لیتا ہے کہ اس میں کسی قسم کے رد و بدل پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اور اسے ہزار دعوتِ غور و فکر دیجئے وہ اس پیغام کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھتا۔ حق و باطل، خیر و شر، کفر و اسلام کی یہی کشمکش ہے جو روزِ ازل سے اس وقت تک جاری و ساری ہے۔ سورۂ اعراف کے بائیسویں رکوع کو کھولئے اور دیکھئے کہ اس حقیقتِ کبریٰ کو کس بصیرت افروز انداز میں بیان فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ
اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۚ قَالُوْا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا
عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ ۝

اور جب تمہارے رب نے بنی آدم سے یعنی اس ذریت سے جو ان کے بعد پیدا ہونے والی تھی، عہد لیا تھا اور انہیں (یعنی ان میں سے ہر ایک کو اس کی فطرت میں) خود اس پر گواہ ٹھہرایا تھا۔ (عہد یہ لیا تھا کہ) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا تھا کہ ہاں تو ہی ہمارا رب ہے ہم نے اس کی گواہی دی۔ اور یہ اس لئے کیا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ تم قیامت کے دن عذر کر بیٹھو کہ ہم اس سے بے خبر تھے۔

یعنی خدا کی ربوبیت کا اقرار خود فطرتِ انسانی کے اندر ودیعت کر کے رکھ دیا گیا ہے اور انسان کی فطرتِ صالحہ کا

تقاضا ہے کہ وہ دین کی اس صراطِ مستقیم پر رہے۔ اب اس سے اگلی آیت میں ہے کہ وراثتی اثرات انسان کو شرک کے غلط راستے پر ڈال دیتے ہیں۔

أَوْ تَقُولُوا إِنَّمَا أَشْرَكَ آبَاؤُنَا مِن قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّن بَعْدِهِمْ ۖ أَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُونَ ۝

یا تم یہ عذر کر بیٹھو کہ شرک ہم سے پہلے ہمارے آباؤ اجداد نے کیا۔ ہم ان کی نسل میں بعد کو پیدا ہوئے اور لاچار وہی چال چلے جس پر پہلوں کو چلتے پایا۔ پھر کیا تو ہمیں اس بات کے لئے ہلاک کرے گا جو ہم سے پہلے جھوٹی راہ چلنے والوں کی تھی! (۷/۱۷۳)

اب یہ واضح ہے کہ فطرتِ صالحہ کا تقاضا کچھ اور ہے اور غلط روی کے آبائی اثرات اس فطرت کو مسخ کر دیتے ہیں۔ ماحول و وراثت کے ان غیر فطری اثرات کو زائل کر کے فطرتِ صحیحہ کو بروئے کار لانے کا کیا طریق ہے؟ اس کے متعلق چار آیات بعد فرمایا کہ یہ صرف خدا کی طرف سے بھیجی ہوئی ہدایت کے اتباع سے ہو سکتا ہے۔

مَن يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِي ۖ وَمَن يُضْلِلْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۝

جسے اللہ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق، ہدایت دے وہی سیدھی راہ پر ہے۔ اور جس پر اسی قانون کے مطابق، راہ گم کر دے تو یہ لوگ خسارے میں ہیں (۷/۱۷۸)

لیکن وہ قانون کیا ہے جس کی رو سے خدا کے نازل کردہ پیغام سے ہدایت حاصل کی جا سکتی ہے اور وہ روش کونسی ہے جس سے اس ہدایت سے مستفید نہیں ہوا جا سکتا؟ اس کی تشریح اگلی آیت میں فرما دی جس میں ارشاد فرمایا کہ ہدایت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان خدا کی دی ہوئی عقل سے کام لے۔ فہم و ادراک کی قوتوں کو کام میں لائے۔ ڈھور ڈنگر کی طرح آنکھیں بند کر کے، جس ڈگر پر چلے آ رہے ہیں اسی پر نہ چلتا جائے۔ اگر انسان نے فکر و تدبر سے کام نہ لیا تو اس پر ہدایت کی روشنی گم ہو جائے گی۔ روشنی سے تو وہی مستنیر ہو سکتا ہے جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے۔ آنکھیں بند کر کے، دوسروں کی لکڑی کے سہارے چلنے والوں کا انجام جہنم ہے۔ فرمایا:

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ ۖ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝

اور کتنے ہی جن اور انسان ہیں جنہیں ہم نے جہنم کے لئے پیدا کیا، یعنی ان کا بالآخر ٹھکانا جہنم ہونے والا ہے، یہ اس لئے کہ ان کے پاس عقل ہے لیکن اس سے سوجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے۔ آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان ہیں مگر ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ وہ عقل و شعور کی قوتوں کو بیکار کر کے، چارپایوں کی مانند ہو گئے۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے۔ ایسے ہی لوگ ہیں

جو یکسر غفلت میں ڈوب گئے۔

یہ ہیں وہ بنیادی خطوط جن پر حق و باطل کی کشمکش متشکل ہوتی چلی آرہی ہے۔ یعنی فطرت صالحہ پر خارجی اور وراثتی اثرات غیر فطری پردے ڈال دیتے ہیں۔ اس پر پیغام خداوندی۔ جو ماحول وراثت کے تمام اثرات سے پاکیزہ و منزہ ہوتا ہے ان کے سامنے آتا ہے۔ تقدیری اثرات کا تقاضا ہوتا ہے کہ انسان اس دعوت پر غور و فکر نہ کرے بلکہ صدیوں سے اسی راہ پر جارہے جس پر اس کے آباؤ اجداد چلتے رہے ہیں اور جیسے وہ وراثتی اور گرد و پیش کے خارجی اثرات کے ماتحت صحیح راہ سمجھ رہا ہے۔ اس کا نتیجہ جہنم ہے اور ہلاکت۔ جس دن سے خدا کا پیغام دنیا میں آنا شروع ہوا، اس دن سے آج تک جہل و بصیرت اور تقلید و تجدید کی یہ کشمکش جاری ہے۔ قرآن کریم میں امم سابقہ کے احوال و کوائف بیان کرکے اس حقیقت ازلی کو بے نقاب کیا گیا ہے تاکہ آنے والے لوگ اس سے عبرت حاصل کریں۔ چنانچہ سورۂ صدر آیات میں مذکور ہے کہ

فاقصص القصص لعلھم یتفکرون ٥ (۷/۱۷۶)

سو اے پیغمبر یہ حکایتیں لوگوں سے بیان کر دو تاکہ وہ ان میں غور و فکر کریں۔

———— ✕ ————

قرآن کریم کے بیان کردہ اُمم سابقہ کے ان قصص و حکایات کو سامنے لائیے اور پھر ان پر غور کیجئے آپ دیکھیں گے کہ بار بار اسی حقیقت کو دہرایا گیا ہے کہ آبائی تقلید سے انسان فطرت کے صحیح راستے سے ہٹ جاتے تھے۔ اس کے بعد حضرات انبیاء کرام علیہم کی وساطت سے آسمانی پیغام ان تک آتا۔ لیکن ان میں سے اکثر اس سے محض اس لئے اعراض برتتے کہ وہ پیغام ان کے آباؤ اجداد کی روش کے خلاف ہوتا۔ حالانکہ اس پیغام کی دعوت سراسر عقل و بصیرت اور غور و تدبر پر مبنی ہوتی۔ لیکن وہ لوگ غور و فکر کے پاس نہ پھٹکتے اور جس راہ پر چلے آرہے تھے اسی پر چلے جانے میں عافیت سمجھتے۔ سب سے پہلے قوم حضرت نوح کو لیجئے۔ ان تک پیغام خداوندی آیا۔ لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ

ما سمعنا بھذا فی اٰبائنا الاولین ٥ (۲۳/۲۴)

ہم نے اپنے اگلے بزرگوں سے ایسی بات کبھی نہیں سنی۔

یعنی انکار کی وجہ یہ ہے کہ یہ دعوت ان کے اسلاف کی روش کے خلاف تھی اور انہوں نے اپنے بزرگوں سے کبھی ایسی بات نہیں سنی تھی۔

قوم نوح کے بعد حضرت ہود کی قوم کو لیجئے۔ جب ان سے کہا گیا کہ ایک خدائے قہار کی عبودیت اختیار کرو تو انہوں نے کہا کہ

اَجئتنا لنعبد اللہ وحدہٗ ونذر ما کان یعبد اٰباؤنا ج (۷/۷۰)

کیا تم صرف اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ ہم صرف ایک خدا کی محکومیت اختیار کریں اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبودیت ہمارے آباؤ اجداد کرتے چلے آئے ہیں۔

یہی ساز کہن کہ جس کی روش پر اسلاف چلتے آرہے ہیں اسے چھوڑ کر اس نئی روش کو کس طرح اختیار کر لیا جائے! یعنی اپنے مسلک کی تائید و صداقت میں کوئی دلیل نہیں کوئی برہان نہیں۔ بس دلیل ہے تو فقط اتنی کہ یہ وہ مسلک ہے جس پر ان کے آباؤ اجداد چلتے آرہے ہیں۔

قوم ہود کے بعد حضرت صالحؑ کی قوم کو دیکھئے۔ قوم کو اس مرد صالح سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں انہوں نے سمجھا تھا کہ یہ ہمارے باپ دادا کی روش پر چل کر ہماری پیشوائی کرے گا۔ لیکن جب اس نے حق و صداقت کی ایسی بات کہہ دی جو اُن کے آبائی مسلک طریق کے خلاف تھی تو انہوں نے منہ پھیر لیا اور کہہ دیا کہ افسوس! کیا افسوس کا مقام ہے۔ اس شخص سے کتنی امیدیں وابستہ تھیں اور اس نے کس طرح ان سب کو خاک میں ملا دیا۔

قالوا یصلح قد کنت فینا مرجوا قبل ھذا اتنھنا ان نعبد ما یعبد اباؤنا واننا لفی شک مما تدعونا الیہ مریب ○ (پ)

انہوں نے کہا کہ اے صالح پہلے تو تو ایک ایسا آدمی تھا کہ ہم سب کی امیدیں تجھ سے وابستہ تھیں پھر کیا تو ہمیں روکتا ہے کہ ہم ان معبودوں کی عبودیت اختیار نہ کریں۔ جن کی عبادت ہمارے آباؤ اجداد کرتے چلے آرہے ہیں۔ ہمیں تو اس بات میں بڑا ہی شک ہے جس کی طرف تم دعوت دیتے ہو کہ ہمارے دل میں نہیں اترتی۔

ایسا ہی جواب حضرت شعیب کو اپنی قوم کی طرف سے ملا۔ انہوں نے قوم کو اس غلط راستے سے روکا جس پر وہ آبائی تقلید کی رو سے آنکھیں بند کر کے چلے آرہے تھے۔ تو قوم نے جواب دیا:

قالوا یشعیب اصلوتک تامرک ان نترک ما یعبد اباؤنا او نفعل فی اموالنا ما نشؤا انک لانت الحلیم الرشید ○ (پ)

قوم نے کہا کہ اے شعیب۔ کیا تیری یہ نماز تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ ہمیں آکر کہے کہ ان معبودوں کو چھوڑ دو جن کی عبودیت تمہارے باپ دادا اختیار کرتے چلے آئے ہیں؟ یا یہ تمہارے اختیار میں نہیں کہ مال میں جس طرح کا تصرف کرنا چاہو کرو۔ بس تم ہی ایک نرم دل اور راست باز آدمی رہ گئے ہو۔

غور فرمائیے! اس جواب سے انکار و اعراض کی راہ اختیار کرنے والوں کی نفسیاتی کیفیت کس طرح جھلک رہی ہے۔ یعنی ہمارے آباؤ اجداد سب غلط راستے پر تھے اور یہی ایک راہ راست پر ہے؟ بڑا آیا کہیں سے تقدس مآب! واقعہ اسلاف کی راہ پر آنکھیں بند کر کے چلنے والوں کی بالکل یہی کیفیت ہو جاتی ہے۔ ان کے قلوب پر بزرگوں کی عظمت و عقیدت اس درجہ چھا جاتی ہے کہ وہ انہیں معصوم اور منزہ عن الخطاء سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ اور اسے برداشت

نہیں کرسکتے کہ کوئی شخص ان کی روش کو غلط بتائے!

یہی کچھ فرعون کی قوم نے کہا۔ جب حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ ان کے پاس خدا کی کھلی ہوئی نشانیاں لیکر گئے۔ جن کا کوئی جواب اُن کے پاس نہ تھا۔ تو بالآخر انہوں نے وہی جواب دیا جو اس سے پیشتر آبائی اثرات کے ماتحت ہر داعی الی الحق کو ملتا چلا آیا تھا۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ
فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ (پ۱۱)

انہوں نے کہا! کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ جس راہ پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو چلتے دیکھا ہے اس سے ہمیں ہٹا دو، اور ملک میں تم دونوں بھائیوں کے لئے سرداری ہو جائے؟ ہم تو تمہاری بات ماننے کے نہیں!

ملت حنیفہ کے مؤسس اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ نے بھی جب اپنی قوم کو اس غلط راہ سے روکا جس پر اُن کے آباؤ اجداد چلتے آرہے تھے تو انہیں بھی یہی جواب ملا کہ یہ وہ راہ ہے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو پایا۔

قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ۝ (پ۱۷)

انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو دیکھا، وہ ان ہی کی پرستش کیا کرتے تھے۔

غرضیکہ جہاں جہاں اور جب کبھی پیغام خداوندی اپنی روشن دلیلوں کے ساتھ پہنچا تو ان لوگوں کی طرف سے جو اپنے آباؤ اجداد کے طور و طریق پر چلے جانے ہی میں عافیت سمجھتے تھے اور ان کے ذہن میں یہ خیال جم چکا تھا کہ اُن کے "اسلاف کبھی غلطی نہ کرسکتے تھے"، انہوں نے ہر جگہ اس پیغام حقیقت کی مخالفت کی۔ چنانچہ سورۂ ابراہیم میں تمام اقوام سابقہ کے متعلق جامع طور پر فرمایا کہ ان میں سے ہر ایک نے یہی روش اختیار کی اور حضرات انبیاء کرامؑ سے یہی کہا کہ

تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (پ۱۳)

تم چاہتے ہو کہ جن معبودوں کی عبودیت ہمارے آباؤ اجداد اختیار کرتے چلے آئے ہیں اُن سے ہمیں روک دو۔

پھر جب ایسا ہوا کہ وہی نور آسمانی جو پہلے مختلف اقوام و ملل کے پاس تبدیلیوں کی شکل میں آتا رہا، ایک مہر عالمتاب بن کر چمکا، تو شپرہ چشم لوگوں نے حسب معمول یہ کہکر اس کی مخالفت کی کہ ہم کبھی آنکھیں نہیں کھولیں گے اس لئے کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو اسی طرح آنکھیں بند کئے ہوئے دیکھا۔

بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓي اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓي اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝ (پ۲۵)

بلکہ انہوں نے کہا کہ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنے اسلاف کو ایک راہ پر چلتے دیکھا اور ہم ان ہی کے

نقشِ قدم پر چلے جا رہے ہیں

ایک دیدۂ بینا کے لئے یہ جواب یقیناً حیرت انگیز تھا کہ روشنی آجانے کے بعد اگر معلوم ہو جائے کہ جس راہ پر مدتوں تک اثرات کے ماتحت چلے جا رہے ہیں وہ راہ ہلاکت و تباہی کے مہیب غاروں کی طرف لئے جا رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اسی راہ پر چلنے پر اصرار کرنا اور اس کے لئے دلیل یہ لانا کہ ہمارے آبا و اجداد اسی راہ پر چلا کرتے تھے کھلی ہوئی حماقت نہیں تو اور کیا ہے؛ اس کے متعلق خود خالقِ فطرت نے بتایا کہ ان کی یہ روش کچھ انوکھی نہیں۔ بلکہ مسخ شدہ فطرتِ انسانی کا تقاضا ہی یہی ہے۔ جہاں جہاں روشنی آتی رہی اسلاف کی تقلید میں آنکھیں بند کر رکھنے والے خفاشوں نے ہمیشہ اس کی طرف سے منہ موڑا۔

وَكَذٰلِكَ مَآ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَآ إِنَّا وَجَدْنَآ ءَابَآءَنَا عَلَىٰٓ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰٓ ءَاثَٰرِهِم مُّقْتَدُونَ ۝ (۴۳/۲۳)

اور اسی طرح (اے رسول!) تجھ سے پہلے بھی جس بستی میں ہم نے کوئی آگاہ کرنے والا بھیجا تو وہاں کے تن آسان لوگوں نے یہی کہا کہ بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے آبا و اجداد کو ایک مسلک پر چلتے دیکھا ہے اور ہم ان ہی کے نقشِ قدم کی پیروی کریں گے۔

جیسا کہ ظاہر ہے یہ دلیل اتنی بودی اور یہ روش ایسی احمقانہ تھی کہ اس کی تردید کے لئے کسی بحث و تمحیص کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس کے جواب میں اتنا ہی کہا جا سکتا تھا کہ جس روش کی طرف ہم دعوت دیتے ہیں وہ مسلک خود تمہارے آبائی مسلک سے کتنا ہی بہتر اور محکم کیوں نہ ہو کیا تم پھر بھی اسی روشِ کہنہ پر ہی چلے جاؤ گے! اپنی اس دعوتِ جدیدہ اور آبائی مسلک کو دلائل و براہین کے ترازو میں رکھ کر تولنے کی کوشش کرو جب تو ہم بتائیں کہ یہ دعوت کس قدر گراں بہا ہے۔ لیکن اگر دلیل فقط اتنی ہو کہ یہ روش چونکہ ہمارے اسلاف کی روش کے خلاف ہے اس لئے سیدھی اور محکم ہے تو اس کا کیا جواب؟

قَٰلَ أَوَلَوْ جِئْتُكُم بِأَهْدَىٰ مِمَّا وَجَدتُّمْ عَلَيْهِ ءَابَآءَكُمْ ۖ قَالُوٓاْ إِنَّا بِمَآ أُرْسِلْتُم بِهِۦ كَٰفِرُونَ ۝ (۴۳/۲۴)

(ان پیغمبر نے) کہا کہ خواہ میں تمہارے پاس اس راہ سے جس پر تمہارے آبا و اجداد چلتے تھے، کہیں زیادہ صحیح راہ لے کر آیا ہوں (تو کیا تم پھر بھی اس پرانی لکیر پر چلتے رہو گے؟) انہوں نے کہا کہ ہمارے پاس دلیل و حجت تو ہے نہیں۔ لیکن بات یہی ہے کہ ہم اس پیغام سے انکار کرتے ہیں جسے دیکر تم بھیجے گئے ہو۔

یہی جواب سلسلۂ انبیائے کرام کی پہلی کڑیوں کی طرف سے دیا جاتا رہا اور یہی جواب اس مقدس سلسلہ کی آخری اور مکمل کر دینے والی کڑی کی طرف سے دیا گیا۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ
آبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ۝

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو ہدایت نازل کی ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقہ پر چلیں گے جس پر اپنے اسلاف کو چلتے دیکھا ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اگر تمہارے بڑے بوڑھے عقل سے کورے اور ہدایت سے محروم رہے ہوں تو تم بھی عقل و ہدایت سے انکار کر دو گے؟

انسانی فساد اور جہالت، بے دانشی اور بے راہ روی۔ وراثتی اثرات کے ماتحت اسلاف کی اندھی تقلید کی یہ داستان ہمارے سامنے ہے جو انسان کی آنکھ کھولنے کے دن سے لے کر حضور خاتم النبیین صلعم کے عہد مبارک تک مذکور ہے لیکن کیا اس کے بعد اس بے دانشی اور اسلاف کی کورانہ تقلید کا سلسلہ ختم ہو گیا؟ ختم کیسے ہو سکتا ہے؟ ابلیس نے تو اللہ تعالیٰ سے قیامت تک کے لئے مہلت لے رکھی ہے، سو جب تک ابن آدم دنیا میں موجود ہے ابلیسانہ حربے بھی اس کی راہ میں موجود رہیں گے۔ پہلی امتوں میں کیا ہوتا تھا؟ کچھ وقت تک لوگ اپنے رسول کے لائے ہوئے پیغام کی اتباع کرتے۔ اس کے بعد جب نفسانی خواہشات اس پر غالب آ جاتیں تو وہ رفتہ رفتہ دوسری شاہراہوں پر چل نکلتے۔ گمراہی کی یہ روش بالارادہ ہوتی۔ لیکن اس کے بعد آنے والی نسلیں غیر شعوری طور پر اپنے آباؤ اجداد کے وراثتی اثرات کے ماتحت اس غیر فطری مسلک کو اختیار کئے جاتیں۔ اس کے بعد ایک نیا رسول آ جاتا۔ اس لئے کہ ان لوگوں نے جہاں اپنے عمل کی راہ بدل لی تھی۔ اس کے ساتھ ہی پیغام خداوندی میں بھی تحریف و الحاق شروع کر دیا تھا۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ پیغام حوادث ارضی و سماوی کے ہاتھوں ضائع ہو جاتا۔ بہرحال وہ پیغام اپنی شکل میں موجود نہ رہتا۔ اس لئے ایک دوسرا رسول آتا اور تجدید دعوت کرتا۔ نبی اکرمؐ کے بعد کسی رسول کی ضرورت باقی نہیں رہی اس لئے کہ خدا کا آخری پیغام اپنی اصلی شکل میں دنیا میں موجود ہے اور موجود رہے گا۔ لیکن اس پیغام کی محض موجودگی اس بات کی دلیل نہیں کہ جس طرح پہلی قومیں راہِ راست کو چھوڑ کر آہستہ آہستہ وراثتی اثرات کے ماتحت غلط راستے پر چل نکلیں یہ قوم غلط روش اختیار نہیں کرے گی۔ غلط روش اختیار کرنے کے لئے سینکڑوں محرکات اور ہزاروں اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس روش سے حفاظتِ حیات کا ایک ہی طریق ہے کہ انسان اپنے ہر ایک قدم کا جائزہ پیغام خداوندی کی روشنی میں لیتا رہے اور جو بھی کوئی قدم غلط طریق پر اٹھنے لگے اسے فوراً قرآن کی صراط مستقیم کی طرف لے جائے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ مسلمان غلط راستے پر چلے۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ فلاں فرقہ غلط راستے پر چلا اور فلاں صحیح روش پر گامزن رہا لیکن بہرحال یہ واقعہ ہے کہ ایک فرقہ نہیں، دوسرا بھی۔ غلط روش پر ضرور چلا اور چلے جا رہا ہے۔ ملت واحدہ کا

فرقوں میں بٹ جانا خود اس امر کی دلیل ہے کہ ہر ایک صحیح روش پر نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر فرقہ یہی سمجھتا ہے کہ ہم راہ راست پر ہیں اور دوسرے فریق غلط روش پر ہیں۔ اب ذرا سوچئے کہ اگر پہلی امتوں میں سے کسی امت کی یہی حالت ہو جاتی جو ہماری ہو چکی ہے (اور آج سے نہیں ایک عرصے سے ہو چکی ہے) اور اُن کی اصلاح کے لئے کوئی رسول آتا اور خدا کا پیغام ان کے سامنے پیش کرتا، تو اُن کی طرف سے کیا جواب ملتا! وہی جواب جو ملتا چلا آیا ہے۔ یعنی یہ کہ چونکہ جو کچھ تم کہتے ہو، وہ ہمارے اسلاف کی روش کے خلاف ہے اس لئے ہم تمہاری نہیں سنتے! اس کے جواب میں وہ وحی الٰہی لا کر پیغام خداوندی کی روشنی کو پیش کرتا۔ لیکن اس کو یہی جواب ملتا جو حضرت صالحؑ کی قوم نے دیا تھا کہ "ہاں ہمارے اسلاف سب غلطی پر تھے۔ بس تم ہی ایک راہ راست پر چلنے والے رہ گئے!" آج ہماری اصلاح کے لئے کوئی رسول نہیں آسکتا۔ لیکن جو روشنی رسولوں کی وساطت سے ملا کرتی تھی وہ تو ہمارے پاس موجود ہے۔ اب دیکھئے کہ آج بھی جو شخص قرآن کریم کی آسمانی قندیل کو سامنے لاکر قوم کو بتاتا ہے کہ اللہ کی متعین کردہ صراط مستقیم کونسی ہے، اسے وہی جواب ملتا ہے یا نہیں جو پہلی قوموں کی طرف سے ملا کرتا تھا! یعنی یہ کہ تم جو کچھ کہتے ہو وہ ہمارے اسلاف کی روش کے خلاف ہے اس لئے ہم اسے قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ بھائی! میں تو کچھ نہیں کہتا۔ کہنے والی تو یہ خدا کی کتاب ہے! اس کا کیا جواب ملتا ہے؟ وہی سازِ کہن کی صدائے بازگشت! "کہ لو بھائی! یہ آگیا کہیں سے بڑا مفسر! بھلا ہمارے بڑے بوڑھے قرآن جانتے تھے؟" وہ کہتا ہے کہ بھائی! اس میں بحث و جدل اور لڑائی جھگڑے کی کوئی بات نہیں۔ یہ ہے قرآن اور یہ ہے تمہاری روش۔ تم خود پرکھ کر دیکھ لو کہ یہ روش قرآن کے مطابق ہے یا نہیں! اس کا جواب کیا ملتا ہے؟ اور اس تمام مباحثہ و مجادلہ کے پیچھے جذبہ محرکہ وہی ایمان، کہ ہمارے آباء و اجداد غلطی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ معصوم اور منزہ عن الخطا تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس سے انسان کے جذبات کو بڑی ٹھیس لگتی ہے اگر اس سے کہا جائے کہ تمہارے بزرگ غلطی بھی کر سکتے تھے۔ بالخصوص جبکہ ان بزرگوں کے ساتھ عقیدت و ارادتمندی کے مقدس جذبات بھی وابستہ ہوں۔ ایسی مقدس ہستی اور غلطی! توبہ، توبہ۔ یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟ لیکن انہیں کون سمجھائے کہ تنقید کی حد سے بالا صرف وحی الٰہی ہوتی ہے۔ انسان سے غلطی کا امکان ہوتا ہے اور غلطی سے کسی انسان کے تقدس اور بزرگی پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ ہم اپنے ہم عصروں میں غلطی کا امکان تسلیم کرتے ہیں۔ ان غلطیوں پر تنقید بھی کرتے ہیں۔ یہی ہم عصر آئندہ نسلوں کے اسلاف بن جائیں گے۔ اس لئے اسلاف میں غلطی کا امکان نہ ماننا یا انہیں تنقید کی حد سے بالاتر سمجھ لینا کس دلیل کے ماتحت ہو سکتا ہے؟ محض یہ واقعہ کہ ایک شخص ہم سے سو برس پیشتر وفات پا چکا ہے اسے منزہ عن الخطا نہیں بنا سکتا! اس کی تحقیقات کو قرآن کی روشنی میں پرکھ لینے سے اس کی کسی قسم کی تحقیر و تذلیل نہیں ہو جاتی۔ ہر شخص کا فہم، ادراک، تحقیق اس کے ماحول اور زمانے سے وابستہ ہوتا ہے۔ اس لئے اگر زمانہ مابعد کا انسان اپنے کسی پیشرو کی تحقیق میں غلطی

دیکھئے تو درحقیقت اس سے اس پیشرو کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ وہ اپنے زمانہ اور ماحول میں گھرا ہوا تھا۔ اس نے جو محنت کی اور مشقت اٹھائی وہ ہمارے نزدیک درخورِ تحسین ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ اس کی محنت کا ماحصل تمام کا تمام وحی منزل کی طرح واجب التسلیم سمجھ لیا جائے۔ پھر یہ تنقید و تحقیق کسی شخص کی ذاتی رائے کے تابع نہیں ہوگی بلکہ قرآن کریم کے مطابق ہوگی۔ اگر زیرِ تنقید معاملہ قرآن کے مطابق ہوا تو ہو المراد۔ اس کے صحیح تسلیم کرنے میں کسے انکار ہو سکتا ہے۔ اور اگر وہ قرآن کریم کے مطابق نہ نکلا تو اس سے رجوع کر لینے میں کونسی خفت ہو جائے گی۔ قرآن کریم تو وہ نصابِ حیات ہے جس کی اتباع کا حکم خود ذاتِ رسالتمآب کو بھی تھا۔

اِتَّبِعْ مَا اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ

اے رسول جو کچھ تیرے رب کی طرف سے وحی کی گئی ہے۔ تم اس کی پیروی کرو۔

اس لئے قرآن کریم کی اتباع میں اگر کسی بڑے سے بڑے بزرگ کا اپنا خیال بھی ترک کر دینا پڑے تو اس میں ذرا سا تامل نہیں ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ حق کو کبھی انسانوں کے ذاتی خیالات کے تابع نہیں ہونا چاہیئے اور جب ایسا ہوتا ہے تو کوئی شے اپنی اصل پر قائم نہیں رہنے پاتی۔ آج ہم جادۂ اعتدال سے اس لئے ہٹے ہوئے ہیں کہ ہم حق کو انسانوں کی آراء کے تابع رکھ چھوڑا ہے اور یہ سب وراثتی اثرات کے ماتحت غیر شعوری طور پر ہو رہا ہے۔ کیونکہ وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْهِنَّ ۔ اگر حق لوگوں کی خواہشات کے تابع ہو جائے تو زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے درہم برہم ہو جائے۔ دینِ خداوندی کے اکمل اور آخری ہونے کی تو دلیل ہی یہی ہے کہ حق ہر وقت اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اس میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہوئی۔ اور یہی حق ہے جو ہر بات کے پرکھنے کا معیار ہے۔ اسی لئے اسلام کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت ہے۔ اندھی تقلید کی بنا پر نہیں۔ کورانہ تعصب میں بصیرت کا کچھ تعلق نہیں ہوتا اور یہ عقل و بصیرت کو اپیل کرنے والی دعوت صرف صاحبِ قرآن (صلعم) کا ہی خاصہ و امتیاز تھا بلکہ حضور کے متبعین کی بھی یہی روشِ زندگی بیان ہوئی ہے۔ ارشاد ہے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْۤ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ

(اے رسول) تم کہدو کہ میری راہ تو یہ ہے کہ میں اس روشنی (بصیرت) کی بنا پر جو میرے سامنے ہے اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور جن لوگوں نے میری اتباع کی ہے وہ بھی (اسی طرح حق کی طرف) دعوت دیتے ہیں۔

فرمایئے کہ جو نظریات و معتقدات، وراثت و ماحول کے اثرات کے ماتحت۔ اسلاف کی بے جا عقیدتمندی کے تابع اختیار کئے جائیں ان کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت کیسے قرار دی جا سکتی ہے۔؟

لیکن مشکل یہ ہے کہ مسلمان یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ اسلاف پرستی اور کورانہ تقلید کے متعلق قرآنی تنبیہ و تنذیر امم سابقہ کے متعلق۔ یا زیادہ سے زیادہ نبی اکرم کے زمانہ کے منکرین کے متعلق ہے۔ ہم سے اس کا کچھ واسطہ نہیں۔ حالانکہ قرآن کریم میں اقوام گذشتہ کے قصص و حکایات اور احوال و کوائف کا ذکر آیا ہی اس لئے ہے کہ آنے والے ان سے عبرت حاصل کریں۔ لیکن ہم ہیں کہ قدم بقدم امم سابقہ کے نقوش و آثار پہ چلے جا رہے ہیں اور دل میں خوش ہیں کہ ہم بالکل صراط مستقیم پر گامزن ہیں۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ رستہ ہمارے اسلاف کا ہے ذرا غور فرمایئے کہ اگر کسی راہ کی صداقت کے لئے اتنا ہی کافی ہو کہ وہ مسلک اسلاف سے منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے تو آپ اپنے زمانہ میں پیدا شدہ فرقوں کے علاوہ کسی اور فرقہ کی کسی روش کی بھی تکذیب نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ وہ کونسا مسلک و مشرب ہے جو بڑے بوڑھوں سے منتقل ہو کر آیندہ نسلوں کو نہیں ملا۔ لہذا حق و صواب کی یہ راہ نہیں کہ اس کے ساتھ اسلاف کے نقوش قدم کی سند ہو بلکہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب زندہ اس کی تائید کرے۔ جب قرآن کریم سامنے آجائے تو اس وقت کوئی چیز خواہ وہ تمہارے اپنے علم و عقل کی پیداوار ہو یا اسلاف سے منتقل ہوتی چلی آ رہی ہو کچھ حقیقت نہیں رکھتی۔ اس وقت حق و صداقت کا تقاضا ہے کہ خدائی سند کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے خواہ اس سے آپ کے اپنے علمی تقاضے کو ٹھیس لگے یا اسلاف کی غلط عقیدتمندی پر حرف کیوں نہ آئے۔ قرآن کریم نے اسی حقیقت کو سورۂ لقمان میں اس طرح بیان فرمایا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا
اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۲۱﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے نازل کیا ہے اس کی پیروی کرو۔ تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ نہیں، ہم تو اسی روش کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آبا کو دیکھا ہے۔ خواہ (اس روش کے مطابق) انہیں شیطان جہنم کے عذاب کی طرف ہی دعوت کیوں نہ دے رہا ہو۔

یہ تو ان کی کیفیت ہے جو اسلاف کے نقوش قدم پر بلا سوچے سمجھے چلے جاتے ہیں ہی نجات و سعادت کی راہ خیال کرتے ہیں۔ اس سے اگلی آیت میں صحیح مسلک کا بیان ہے۔

وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ
الْوُثْقٰى ؕ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۲۲﴾ (۳۱/۲۲)

اور جس نے اپنے آپ کو بخلوص قلب خدا (کے پیغام) کے سامنے جھکا دیا، تو اس نے یقیناً ایک مضبوط شاخ کو پکڑ لیا اور انجام کار سب اللہ ہی کی طرف ہے۔

یعنی دین کا حکم نہ تو یہ ہے کہ تم اپنے خیالات کی ہی اتباع کرنے لگ جاؤ، اور نہ یہ کہ جو کچھ اسلاف سے منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے بغیر سمجھے بوجھے اس پر گامزن ہوتے چلے جاؤ۔ دین قیم یہ ہے کہ اپنے خیالات اور اسلاف کی

طرف سے منتقل ہونے والے معتقدات سب کو قرآن کریم کی میزان پر رکھ دو۔ جو وہاں سے پورا اترے وہ قابلِ تسلیم، جس کا وہاں کچھ وزن نہ ہو بلا تامل رد کر دینے کے قابل۔ یہ وہ عروۃ الوثقیٰ ہے جسے شکست و ریخت کا کوئی خوف نہیں۔ یہ وہ متاعِ گراں بہا ہے جسے کسی رہزن کا خطر نہیں۔

اس مسلکِ صحیح کی اتباع کی ضرورت یوں تو عام حالات میں بھی کچھ کم نہ تھی لیکن اب جبکہ ہمارے سامنے ایک نئی زندگی اور زندگی کی نئی تعمیر آ گئی ہے۔ جب ہم نے اپنی زندگیوں کے لئے نئے قالب اختیار کرنے ہیں۔ جب اپنے لئے ایک نیا نظامِ حیات مرتب کرنا ہے۔ اس مسلک کی ضرورت اور بھی شدید ہو گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت آئین کی تدوین میں جو مشکل سب سے زیادہ عناں گیر ہو رہی ہے وہ یہی احساس ہے کہ جو عقائد اور احکام جو اسلاف سے متوارث چلے آ رہے ہیں، ایسے ہیں جو ہماری نئی زندگی کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتے لیکن چونکہ انہیں۔ مذہب۔ کی مقدس سند مل چکی ہے اس لئے انہیں چھوڑتے ہوئے ایک جھجک سی محسوس ہو رہی ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ نہ ان تصورات کو قائم ہی رکھا جا سکتا ہے نہ چھوڑا ہی جا سکتا ہے۔ قائم رکھنے میں زندگی کے مسائل حل نہیں ہوتے۔ چھوڑنے میں مذہب کی خلاف ورزی کا احساس دامنگیر ہو جاتا ہے۔

غرض دو گونہ عذاب است جانِ مجنوں را

لیکن یہ مشکل ہماری اپنی پیدا کردہ ہے، حقیقی نہیں ہے۔ اس کا علاج واضح ہے۔ یعنی ہم خدا کی کتاب کو اپنا نصب العین قرار دیں اور اس کے سوا جو کچھ ہمارے قلوب و اذہان پر مستولی ہے اسے اس میزان پر تول لیں۔ جو اس پر پورا اترے وہ قابلِ قبول۔ جو پورا نہ اترے وہ جھٹک کر پھینک دینے کے قابل، خواہ اس کی نسبت کسی سے بھی کیوں نہ کی جا رہی ہو۔

اسباب زوال امت

[میرزا عبداللہ انور بیگ، ایم۔اے، ایل ایل۔بی، ایڈووکیٹ لاہور کی کتاب تعمیر نو کا ایک باب]

چھٹی صدی عیسوی میں جب کہ روئے زمین پر یونان و روم۔ مصر و ایران اور ہند و چین کے ممالک میں ایک یا دوسری تہذیب کا اقتدار تھا۔ اور قومیں باہمی تغلب اور تصادم کے فطری جذبات سے ایک دوسرے سے الجھ رہی تھیں۔ عرب کے ریگستان سے عالم کی رہنمائی کے لئے حضور سرور کائنات محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ظہور ہوا۔

عرب ایک وحشی قوم تھے۔ باہمی جنگ و جدال میں مصروف رہتے۔ بتوں کی پوجا کرتے۔ عزیزوں اور رشتہ داروں کے حقوق کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ ایسی قوم کے مجلسی نظام کی درستی کے لئے یقیناً قدرت کی طرف سے ایک رہنما کی ضرورت تھی۔ حضور کی شخصیت اور حق پرستی عربوں کے لئے پیام امید تھی آپ کی مقناطیسی شخصیت نے تھوڑے عرصہ میں انہیں اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور بکھرے ہوئے عربوں کی مجلسی اصلاح فرما کر انہیں ایک منظم اور طاقتور قوم بنا دیا۔ جس کو اپنی دینی اور دنیوی فلاح کا قوی ایمان حاصل تھا۔ آپ کے مذہب نے جسے اسلام کے پاکیزہ نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ عربوں کی ذہنیت کو یکسر بدل دیا۔ وہ روشنی طبع۔ ذہنی لطافت اور جسدی طاقت سے مالا مال ہو گئے۔ اور وہ قوت منظمہ جو قوم کے اتحاد و ارتباط کے لئے ازبس ضرور ہے۔ انہیں خود بخود حاصل ہو گئی۔ صحرائی قبائل کو آوارہ گردی میں ایک نئی زندگی حاصل ہوئی۔ خواب گراں سے بیدار ہو گئے۔ اور اقوام عالم کے معرکۂ حیات میں اکثر قوموں سے بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ مختلف ممالک میں نوید اسلام پہنچائی گئی۔ اور شاہان وقت کے نام تبلیغی خطوط ارسال کئے گئے۔ اور تھوڑے سے عرصہ میں عرب گرد و نواح کے ممالک

میں پھیل گئے۔ سنہ ۱۳ھ میں عربوں کے فوجی دستے ایران میں داخل ہو گئے۔ چند مقابلوں کے بعد جنگ قادسیہ کی نوبت آئی۔ جہاں پر سلطنت ساسانیہ کی قسمت کا فیصلہ کر دیا گیا۔ سنہ ۱۵ھ میں فتح یرموک کے بعد شام پر غلبہ حاصل کر لیا گیا۔ سنہ ۲۰ھ میں عرب مصر میں داخل ہوئے۔ اور سنہ ۲۱ھ میں جنگ نہاوند نے مسائل سیاسی کو بہت حد تک حل کر دیا۔

سنہ ۳۱ھ یزدگرد مارا گیا۔ اس طرح سلطنت ساسانیہ کا خاتمہ ہوا۔ اب ممالک شرقیہ۔ بلخ اور جیحوں تک عربوں کے قبضہ میں تھے۔

خلفائے راشدین نے روئے زمین پر پہلی دفعہ ایک جمہوری سلطنت کو قائم کیا مساوات اخوت اور آزادی اس کے ستون تھے۔ اور پہلی دفعہ سیاسی امور میں مشاورت عامہ پر انحصار کیا گیا۔ حاکم وقت (امیرالمومنین) سادہ زندگی بسر کرتے۔ اور معاملات ملی میں جمہور کے سامنے مسئول تھے۔ حق کی حفاظت کے لئے جہاد کو نکلتے۔ دین و دنیا کی جدوجہد کے لئے مسلمانوں کے پاس نور ہدایت قرآن تھا۔ جس کی روشنی میں اسلامی قومیں روئے زمین پر پھیل گئیں ابتدائی دور میں بنی اُمیّہ کا زور رہا۔ جنہوں نے پہلی دفعہ یورپ روم کے علاقوں میں مثلاً روم و یونان میں جمہوری سلطنت کو روشناس کرایا۔ چنانچہ گردونواح کی حکومتوں کے نظام میں اموی طریقۂ حکومت کی پیروی کی جانے لگی۔ بنی اُمیّہ کی سلطنت سنہ ۱۳۲ھ میں ختم ہوئی۔ خاندان اُمیّہ میں سے امیر عبدالرحمان نے ہسپانیہ میں ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی قرطبہ کو اس کا دارالخلافہ بنایا۔ اس کا خاندان سنہ ۱۳۸ھ سے سنہ ۴۲۲ھ تک ہسپانیہ میں حکومت کرتا رہا۔ جسے یورپ کی عیسائی طاقتوں نے مغلوب کیا۔ بنی اُمیّہ کے بعد عباسی دور شروع ہوا۔ جس کے مشہور فرمانروا ابوالعباس۔ ابوجعفر المنصور۔ مہدی۔ ہادی۔ ہارون الرشید المامون وغیرہ تھے۔ مستعصم اس سلسلہ کی آخری کڑی تھا ایران میں سامانی۔ دیلمی اور غزنوی حکومتیں قائم ہوئیں۔ مغلوں میں سے مشہور فاتح تیمور اسلام سے مشرف ہوا۔ اس نے اپنے مقبوضات میں ترک و مغل رسم و رواج کی بجائے اسلامی شریعت کا

نفاذ کیا۔ ایران میں قرون آخری میں صفوی اور قاچاری خاندانوں کی حکومت رہی۔ افغانستان کے احول میں غوری اور غزنوی برسر اقتدار رہے۔ عثمانی ترکوں نے سلطنت عثمانیہ ترکیہ کی بنیاد ڈالی جس میں یورپ۔ ایشیا اور افریقہ کے وسیع ٹکڑے شامل رہے۔ اس کا پہلا فرمانروا عثمان تھا۔ جس کے بعد بیسویں صدی تک فرمانرواؤں کا ایک طویل سلسلہ قائم رہا۔ آخری دور میں خلافت اسی خاندان سے متعلق رہی۔

ہندوستان میں ترک۔ خلجی۔ تغلق۔ سید۔ لودھی خاندان حکومت کرتے رہے۔ جن کے بعد سلطنت مغلیہ قائم ہوئی۔ جس کے تاجداران شہیر۔ بابر۔ ہمایوں۔ اکبر۔ جہانگیر۔ شاہ جہاں۔ اورنگ زیب تھے۔ جن کی اولاد اٹھارویں صدی تک حکمران رہی۔

اسلام کی فطری تعلیم نے مسلمانوں کو ایک با اقتدار قوم بنا دیا۔ جس کی عسکری روح نے مختصر سے عرصہ میں گردو نواح کے ممالک کو زیر نگیں کر لیا۔ دنیوی جاہ و حشمت کے ساتھ ساتھ علوم و فنون کی پرورش کی۔ یورپ میں علوم و فنون کی نشر و اشاعت سے قرون وسطیٰ کی جہالت کو نور سے بدل دیا۔ روم و یونان کو دور جدید سے متعارف کرایا۔ ایران کو مجوسیت سے نجات دلائی۔ اصنام ہند کے کانوں تک صدائے توحید پہنچائی۔ اور اس طرح نظام انسانی کو ایک نئی تشکیل کی طرف حرکت دی۔ ایک ہزار سال تک اسلام ایک ہمہ گیر جاذب و عالم قوت کی حیثیت سے نظام عالم کو حرکت میں لاتا رہا۔ لیکن انیسویں صدی کے اوائل میں دنیائے اسلام میں ایسی علامات ظہور پذیر ہونے لگیں۔ جو اس کے اندرونی نقائص کا پتہ دیتی تھیں۔ لیکن چونکہ اسباب کو معلوم کرنے کے بعد ان کو دور کرنے کی چنداں کوشش نہ کی گئی۔ اس لئے حالات نے بحران کی صورت اختیار کر لی۔ یعنی روح و جسد کی باہمی کشمکش نازک لمحات تک پہنچ گئی۔

ہندوستان میں عالمگیر علیہ الرحمۃ کی وفات (سنہ ۱۷۰۷ء) کے بعد بہادر شاہ نے پانچ سال حکومت کی۔ اس کے بعد اس کے تین لڑکے یکے بعد دیگرے تخت دہلی پر بیٹھے۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے محمد شاہ کے زمانے میں ہندوستان پر حملہ کیا۔ اور دارالسلطنت کو لوٹا۔ نادر شاہی حملہ کے بعد مغل

فرمانروا صحیح معنوں میں سلطنت سے قاصر رہے۔ اور سلطنتِ مغلیہ شمعِ سحری کی مانند ۱۸۵۷ء کے انقلاب تک ٹمٹماتی رہی۔ ایران و افغانستان کے حالات انیسوی صدی کے آغاز سے پیچیدہ ہونے شروع ہوئے کیونکہ یورپی قومیں مشرق کی خستہ تن قوموں میں سیاسی تغلب کے درپے تھیں۔ ایران اور جنوبی ہند میں نپولین کی ریشہ دوانیاں بذاتِ خود ایک خطرہ تھیں۔ ہرچند اسے انگریزوں سے دشمنی تھی۔ افغانستان کو بیک وقت روس۔ ایران اور ہندوستان سے جغرافیائی تعلق تھا۔ اس لئے روسی اور انگریزی حکومتیں افغانستان کو اپنی سیاسی طلسم کاریوں کی جولانگاہ بنائے ہوئے تھیں۔ شاہ شجاع اور دوست محمد خان کے زمانے میں صورتِ حالات بگڑی پھر خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں۔ اس کے بعد امیر شیر علی۔ امیر عبدالرحمان خان اور امیر حبیب اللہ خان کے زمانہ میں امورِ سیاسی کی سلکِ جمعیت دو زبردست طاقتوں کے درمیان مجبوری اور بے چارگی میں پریشان رہی۔

۱۷۹۷ء میں آغا محمد شاہ خاندان قاچاریہ کا بانی قتل ہوا۔ اس کے بعد فتح علی شاہ قاچار تخت پر متمکن ہوا۔ اس کے عہدِ حکومت میں ۱۸۰۱ء میں گرجستان کا علاقہ روس سے ملحق ہو گیا۔ آہستہ آہستہ دوسرے مقامات مثلاً غازان۔ داغستان اور شیروان بھی روسی قبضہ میں چلے گئے ۱۸۱۳ء میں اہلِ برطانیہ اس کشمکش میں شریک ہوئے ۱۸۳۴ء میں فتح علی شاہ نے وفات پائی۔ اس کے بعد محمد شاہ تخت پر بیٹھا۔ اس کی وفات پر ۱۸۴۸ء میں ناصرالدین بادشاہ ہوا ۱۸۹۶ء میں ناصرالدین کا بیٹا مظفرالدین تخت نشین ہوا۔ اُسے مجلسِ شوریٰ قائم کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اس کے بعد احمد علی مرزا اور احمد مرزا یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے۔

۲۰ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو ترکی بحری بیڑے نے انگلستان۔ فرانس اور ایران کے متحدہ بحری بیڑے کے ہاتھوں زبردست شکست کھائی۔ دوسرے سال روس نے ترکی پر حملہ کیا۔ یہ کشمکش ۱۸۲۹ء تک جاری رہی۔ ۱۸۹۷ء میں یونان اور ترکی کے درمیان جنگ ہوئی۔ روس۔ یونان اور انگلستان کی سلطنتیں ترکوں کی الجھنوں میں اضافہ کر رہی تھیں۔ ترکی کو یورپ کا "مردِ بیمار" کہا جاتا تھا۔ سلطنت ترکیہ کی پریشانی روز افزوں تھی۔ سلطنت کا شیرازہ بکھرتے دیکھ کر عیسائی قوموں نے مختلف علاقوں پر قبضہ کرنے کی

عثمانی۔ روس نے کریمیا اور کاکیشیا پر قبضہ کر لیا۔ استانبول اور درہ دانیال کی شاہراہ پر حق ظاہر کیا۔ فرانس نے شام اور ٹیونس پر دست درازی کی۔ انگلستان نے مصر اور سائپرس پر قبضہ کر لیا شاہ جرمنی نے سلطان عبدالحمید کی یورپ کے مقابلے میں اس لئے طرفداری کی۔ تاکہ دوسرے امیدوارں کو شکست دے کر خود اس پر قابض ہو جائے۔ اس طرح بیسویں صدی میں یورپ کی عیسائی طاقتیں سلطنت ترکیہ کے گرد گدھوں کی طرح منڈلا رہی تھیں۔

الغرض دو صدی کے اندر دنیائے اسلام زیر و زبر ہو گئی۔ اور وہ حکمران قوت جو مشرق و مغرب کے درمیان کئی ایک عظیم الشان سلطنتوں اور لاتعداد قوموں کو ہانکتی تھی۔ ان قوموں کا ساتھ چھوڑ بیٹھی اور سلطنتوں کے عظیم و رفیع محلات میں شکست و ریخت نمودار ہونے لگی۔ اور مسلمان قومیں دیوار کہنہ کی طرح گرنے لگیں۔ ایسے ہمہ گیر تخریبی عمل کے نتائج فروعی حیثیت سے دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ میں ظاہر ہوئے۔ جابجا مجلسی امراض پیدا ہو گئے جس کا نتیجہ ذہنی اور جسمانی تعطل ہوا۔ نکبت و ذلت میں گرفتار ہو گئے۔ اور اتفاق و اتحاد کی قوت سلب ہو گئی۔ روایتی شان و شکوہ سے محروم ہو گئے۔

اتنے بڑے عظیم الشان نظام میں خرابی آنے پر یقیناً سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ آخر وہ کونسے وجوہ تھے جن کے پیش نظر مسلمان موجودہ زوال تک پہنچے۔ اس اہم سوال کے جواب میں مختلف حلقوں میں مختلف جواب دئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اسلام کی حقیقتوں سے ناآشنا مغربی لوگ اس زوال کے اسباب شریعت پیغمبر میں دیکھتے ہیں۔ جو کہ بقول سعید حلیم پاشا (وزیراعظم ترکی) منطقی اور تاریخی حقیقت کے خلاف ہے۔ کیونکہ اگر ایسے نقائص شریعت پیغمبر میں ہوتے تو مسلمان قطعاً ترقی نہ کر سکتے۔

مرحوم کے نزدیک مسلمانوں کے زوال کی وجہ اسلامی فرائض سے تغافل ہے۔ اور مسلمانوں کا سیاسی زوال مادی انحطاط کی وجہ سے رونما ہوا۔

زوال اسلام کے کئی ایک وجوہ ہیں۔ زمانے میں نظام انسانی ایک ذی حیات عالم ہے۔ اس کے مختلف طبقات کے عروج و زوال زندگی کے نشیب و فراز کی مانند ہیں۔ جن کا مطالعہ ماحول اور ذی حیات جسم کے باہمی تاثرات کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔ طبقات انسانی میں درختوں کی طرح نشوونما

کا عمل ہے۔ مناسب فضا خوراک اور زمین میں پرورش پاتے ہیں۔ اور بعض اوقات مختلف قسم کی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جن سے بچنے کے لئے فطری مدافعت کی ضرورت ہے۔ جس طرح فنا کے انسان کے لئے بعض اوقات جسمانی بیماریاں اپنی ذات اور ماحول سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور بعض اوقات ذہنی بیماریاں جسمانی بیماریوں کی وجہ بن کر جسم کو فنا کے گھاٹ اتار دیتی ہیں۔ ایک بیماری سے فنا طاری ہو سکتی ہے یا ایک بیماری سے کئی دوسری بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بعینہٖ انسان کے مجلسی نظام کو درہم برہم کرنے کے لیئے کئی قسم کے مجلسی امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہی مرض سے فنا طاری ہو جائے۔ یا اس مرض سے کئی دوسرے امراض پیدا ہو جائیں۔ اور قوم نیست و نابود ہو جائے۔ یا کچھ عرصہ کے لئے مریض رہ کر صحت یاب ہو سکے۔ مجلسی نظام کی فرد واحد کے جسم کی طرح حفاظت کی ضرورت ہے۔ ماحول کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ تحفظ ذات کا مسئلہ واضح طور پہ پیش نظر رہے۔ ذہن انسانی کی حفاظت زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ ذہن انسانی مجلسی نظام کا راہنما ہے۔ اور ذہنی امراض سے دیگر امراض پیدا ہوتے ہیں۔ جن سے جماعتی روح زوال پذیر ہو جاتی ہے۔ ذہن یا جسم میں ایک یا دوسرے نقائص پیدا ہونے سے روحِ تغلب کا فنا لازم آتا ہے۔ جس کے سہارے قومیں زمانے کی قوتوں پر غلبہ پاتی ہیں۔ افراد کی کیفیت سے مجلسی نظام پا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ افراد کی کمزوری سے روحِ تغلب قوموں سے غائب ہو جاتی ہے۔ اور قومیں شاہراہ زندگی پر ایک تھکے ماندے مسافر کی طرح بیچارگی سے سفر کرتی ہیں۔ اس حالت کو عرف عام میں زوال کہا جاتا ہے۔

درختوں کے برعکس طبقات انسانی محرکاتِ ذہنی یا خصائص نفسانی کے ماتحت حرکت کرتے ہیں۔ اور انہی سے انسان تکمیل حیات کو پہنچتا ہے۔ محرکات خصائصِ نفسانی کے آئینہ دار ہیں۔ اور تہذیب انسانی کے لئے مرکز کا حکم رکھتے ہیں۔ قوموں کے معتقدات اساسی کی بنیاد خصائص نفسانی پر ہے۔ انسان کے نظام حکومت، تمدن و معاشرت کی بنیاد انہی خصائص پر ہے معتقدات اساسی کے تغیر سے ان میں فرق آ جاتا ہے۔ تہذیب و تمدن کے تحفظ کے لئے ان معتقدات کو بیرونی اثرات سے محفوظ رکھنا چاہئے۔ کیونکہ ان کے فنا ہونے سے نظام حکومت، تمدن و معاشرت بھی فنا ہو جاتے ہیں۔

قوموں کو اصولی افکار وراثت میں ملتے ہیں۔ ان اصولی افکار سے فروعی افکار پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ طولِ زمان سے حقائقِ محض نہیں بدلتے۔ چنانچہ قوموں کی عقل و دانش میں کم فرق آتا ہے۔ البتہ معتقدات تغیر پذیر ہوتے ہیں۔ جن سے تہذیب و تمدن میں عروج و زوال کے انقلاب رونما ہوتے ہیں۔ کیا مسلمانانِ عالم محرکاتِ ذہنی کا تحفظ کر سکے ہیں؟ کیا اُن کے افکار و معتقدات تغیر پذیر تو نہیں ہو چکے؟

طبقاتِ انسانی تنازع للبقا کے اصول کے ماتحت ایک دوسرے سے بقائے ذات کے لئے تغلب چاہتے ہیں۔ چونکہ تغلب کے لئے مادی وسائل کی ضرورت ہے۔ اس لئے قوموں کے عروج و زوال میں ذہنی تغیر کے بعد مادی قوت کارفرما رہتی ہے۔ تہذیب و تمدن اور سیاسی تغلب کے لئے مادی انحطاط پیغامِ اجل ہے۔ غریب قومیں کوئی تہذیب و تمدن نہیں رکھتیں۔ غربت اور امراض انہیں گھیرے رکھتے ہیں۔ حوصلے پست رہتے ہیں۔ اور زندگی کی مبارزت طلب دلہن کی تاب نہ لا کر محض اوقات بسری کے لئے عالم میں گوشۂ عافیت ڈھونڈنے کے لئے مصروف رہتے ہیں۔

دیگر وجوہاتِ زوال کے لئے اسلامی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا۔ کہ اوائلِ اسلام میں جس نظامِ جمہوری کی بنیاد "وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ" پر تھی۔ اس نے کچھ وقت کے بعد شخصی حکومت کی صورت اختیار کر لی۔ ایرانی۔ تورانی۔ ہندی۔ مصری حکومتیں جغرافیائی حالات کے ماتحت قرآنی نظریہ حکومت سے دُور جا پڑیں۔ چنانچہ عباسی۔ سلجوقی۔ خلجی اور مغل فطری جذبۂ تغلب کے مظاہرہ میں مصروف رہے۔ اور قرآنی احکام کی روشنی میں اپنا چہرہ نہ دیکھ سکے۔ اسلام میں حکومت کی بنیاد جمہوریہ ہے۔ مگر شخصیت کے دلدادہ حکام نے رائے عامہ کی کچھ پرواہ نہ کی جاہ پرست اُمرا کی خود پرستی نے مختلف سلطنتوں کے نظام بگاڑ دیئے۔ اور اس کا نتیجہ دنیائے اسلام کو سیاسی بیچارگی اور مادی کمزوری کی شکل میں دیکھنا پڑا۔

جغرافیائی حالات کے ماتحت مسلمان مختلف ممالک میں اجنبی اثرات کو قبول کرتے رہے۔ ذہنی افکار و معتقدات میں فرق آیا۔ اگرچہ علمائے مذہبی تحفظ کے لئے پابندی ظاہر کی تاکید کی۔ اور

اس طرح مسلمان ایک ظاہری جماعت کی حیثیت سے قائم رہی۔ مگر ضرورت تھی کہ اصول اسلامی کو ایک زندہ جسم کی حالت میں قائم رکھا جاتا۔ روح اسلام کی پرورش کو نظرانداز کر دیا گیا۔ اور جسد اسلام کی حفاظت کو مقدم سمجھا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دل و دماغ بوسیدہ ہو گئے۔ اور اصول اسلامی کی نشوونما رُک گئی۔ عجمی تصوف نے آریائی ترک دنیا کی تعلیم کو عام کر دیا۔ اور اسلامی ذوق عمل کو تصوف سے بدل دیا۔ ہند و ایران و ترکی میں لاتعداد خانقاہیں قائم ہوئیں۔ جن میں صوفیا و فقراء دنیا سے منہ موڑ کر عاقبت سے رشتہ جوڑنے کے لئے پناہ گزین ہوئے۔ تصوف نے شعر و شاعری پر بے پناہ اثر ڈالا۔ اشعار کے ذریعہ سے یہ زہر غیر محسوس طور پر اسلامی قوموں کی رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ چونکہ شعر کو دل سے ایک فطری مناسبت ہے۔ اس کے اثر سے ہر کس و ناکس متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ اسلامی افکار و معتقدات اس کی زد سے نہ بچ سکے۔ اور تخیل کا ارتقا رُک گیا۔ تیرھویں صدی میں تاتاریوں نے بغداد پر حملہ کیا۔ جس سے اسلام کے مذہبی اور مجلسی قصر کو سخت صدمہ پہنچا۔ علماء نے مذہبی حیثیت کو قائم رکھنے کے لئے مجلسی زندگی میں وضع اسلامی کے قیام کی تاکید کی۔ اور قوانین شریعت میں جیسا کہ ائمہ سابقہ نے توضیح کی تھی۔ مداخلت قطعاً گوارا نہ کی۔ (رجا حنبلی اور نظام کی تحریکات اسی دور کی یادگار ہیں) انہیں مجلسی نظام کا تحفظ مقصود تھا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں وہ بنیادی طور پر ٹھیک تھے کیونکہ تنظیم ایک حد تک تخریبی قوا کا مقابلہ کرتی ہے۔ مگر وہ لوگ نہ دیکھ سکے۔ اور علمائے جدید نہیں دیکھتے کہ انجام کار لوگوں کی قسمت کا انحصار اس قدر تنظیم پر نہیں۔ جتنا کہ افراد کی قابلیت اور طاقت پر ہے۔ ضرورت سے زیادہ منظم مجلس میں فرد پس کر رہ جاتا ہے۔ وہ گرد و نواح سے فکر مجلسی کا سرمایہ حاصل کرتا ہے۔ اور اپنی روح کو ضائع کر بیٹھتا ہے۔ اس طرح تاریخ قدیم کی غلط پرستش اور اس کا مصنوعی احیا کسی قوم کے زوال کے لئے کسی دوا کا کام نہیں دیتا۔ تنہا مؤثر قوت جو کسی قوم کے تخریبی قوا کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ وہ اپنی ذات پر سرگرمیوں کو مرکوز رکھنے والے افراد کی پرورش ہے۔" (اقبال)

"میرے نزدیک مسلمانوں کی مذکورہ بالا ذہنیت کا منبع ہونا جو کہ مغربی مجلس کے اثرات کی

قبولیت پر اسلامی مجلس کے دوبارہ احیا کو ڈھونڈھتی ہے۔ مغربی تغلب کے منحوس اثر کی وجہ سے ہے جس نے شریعتِ پیغمبر کو تسلیم کرنے والی قوموں نے برداشت کیا ـــــــ وہ تغلب جس نے اُن کے ذہن کو منکسر کر دیا ہے۔ میں اُن کی اِن غلطیوں کو رفع کرنا چاہتا ہوں۔ کہ اخلاقی اور مجلسی نقطہ نگاہ سے دنیائے اسلام کو مغرب پر رشک کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے خلاف ان امور میں عیسائی ممالک کو اسلام سے سبق لینا چاہیے۔ اس اہم سوال کی تشریح کے لئے بہتر ہوگا۔ کہ اسلام کے مجلسی کارناموں کو واضح طور پہ بیان کیا جائے۔ اس یاددہانی سے میرے ہم وطنوں اور ہم کیشوں کو یقین ہو جائے گا۔ کہ اصلاحِ اسلام سے مراد صرف اس عظیم الشان مذہب کی تعلیمات کو بہتر طور پہ سمجھنا اور انہیں بہتر طور پر عمل میں لانا ہے۔"

"دنیائے اسلام کے مادی انحطاط کا نتیجہ سیاسی زوال پر منتج ہوا۔ اسباب کی کمی اور مادی کمزوری کی وجہ سے یہ مغرب کے حریصانہ عزائم کے مقابلہ میں اپنے تحفظ میں قاصر رہی۔" (حلیم پاشا)

"انحطاط و تنزّل اہلِ اسلام کا سبب اُن کے اعمال میں کمی اور کوتاہی اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی کتاب کی تعلیمات کی بجا آوری میں فتور کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ اللہ کی کتاب ہی کی تعلیم وہ چیز ہے۔ جو ہمیں حقیقی ترقی اور تعالیٰ اور بلندیوں کی چوٹی کی طرف راہنمائی کر سکتی ہے۔ اور میں نے یورپ کی سیاحت کے اثنا میں دیکھا ہے۔ کہ اورپ والوں نے واقعی قرآن مجید سے استفادہ کیا ہے۔ اور اسی پر وہ اپنے امورِ سیاسیہ وغیرہ کے قوانین مبنی قرار دیتے ہیں۔ اور ہم اس سے غافل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ باوجود اس کے ہمارا دعویٰ ہے کہ قرآن مجید ہماری مقدس کتاب ہے۔ اور ہم اس پر ایمان لاتے ہیں۔ لیکن ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ جب تک عمل نہ ہو۔ اور میں نے عزم کر لیا کہ جب تک مسندِ سلطنت پر متمکن رہوں گا۔ اجرائے امور اور احکامِ سیاست کو قرآن مجید ہی کی تعلیم پر مبنی قرار دوں گا۔ اور اپنی رعیت میں اس کے نشر کی کما حقہ، کوشش کروں گا۔" (امان اللہ خان)

"کسی قوم کا ترقی کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہونا یا علوم و فنون کے مختلف شعبوں میں کمال حاصل کرنا یا علوم حقہ کے نکات سے کما حقہ، آگاہ ہونا یا ایسے علوم کی تحصیل کرنا جو اُن کے مادی یا معنوی ارتقا کا موجب ہوں۔ ان چند اصولوں سے وابستہ ہے۔

(۱) اول یہ کہ ہر ترقی خواہ قوم کی عقل توہماتِ باطلہ کے زنگ سے صاف اور واہیات و خرافات سے

عقائد کی کدورات سے پاک ہو۔ کیونکہ خرافات عقائد انکشافِ حقیقت میں حائل ہو جاتے ہیں۔ توہمات کا معتقد کبھی واقعاتِ حقہ کی جستجو نہیں کرتا۔ بلکہ جب کوئی لایعنی عقیدہ قائم ہو جاتا ہے۔ تو عقل معطل ہو کر غور و فکر سے انکار کر دیتی ہے۔ ایسا شخص ہمیشہ حقیقت نفس الامری سے دور اور وحشت و دہشت اور خوف میں گرفتار رہتا ہے۔ حیوانات کی حرکات اور پرندوں کی آواز سے گھبراتا ہے۔ بادل کی کڑک اور بجلی کی چمک سے کانپتا ہے۔ فال بینی اور شگون کے اوہام میں پھنس کر سعادت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور ہر دجال اور فریب کار سے مرعوب ہو کر گردن جھکا دیتا ہے۔ ایسی تاریک زندگی سے بڑھ کر اور کیا شقاوت اور سیاہ بختی ہو گی۔

اسلام کا سب سے پہلا رکن توحید ہے۔ جو کل توہمات سے عقل کو جلا دیتی ہے۔ توحید کی اولین تعلیم یہ ہے کہ انسان کسی انسان یا درخت یا پتھر یا اجرامِ سماوی وارضی میں سے کسی کو خالق رازق یا متصرف نہ سمجھے۔ بغیر صانع حقیقی کے کسی کو عزت و دولت دینے والا۔ موت و حیات بخشنے والا۔ مانع و معطی نہ جانے۔ یہ خیال بھی نہ کرے کہ خداوند تعالیٰ انسانی جامہ میں ظہور فرما کر اصلاح عالم کا بندوبست کرتا ہے۔ یا کسی مصلحت کے لئے لباسِ بشری میں نمودار ہوا۔ اور کئی طرح کے مصائب برداشت کئے یا اس قسم کے کئی اور لایعنی عقائد جو عقل کو اندھا اور معطل کرنے کے واسطے کافی ہیں۔ اسلام کے سوا موجودہ تمام مذاہب میں ایسے ہی خرافات تسلیم شدہ عقائد ہیں۔

(۲) قوم کے ہر فرد میں یہ جذبہ موجود ہو کہ بغیر از نبوت جو محض وہبی امر ہے۔ جو کسب و تحصیل یا سعی و کوشش سے میسر نہیں ہو سکتی۔ دوسرے ہر قسم کے کمالات و فضائل کا مستحق اپنے آپ کو سمجھے۔ ناممکن و مشکل جیسے حوصلہ شکن خیالات اس کے دماغ میں جاگزیں نہ ہوں۔ جب انسان میں یہ ہمت ہو گی۔ تو میدان مسابقت میں تگ و دو کر کے اعلیٰ درجات پر فائز ہو گا۔ ایسا شخص مادی اور روحانی عزت و آبرو کے حصول میں بھی کبھی کوتاہی نہیں کرے گا۔ برخلاف اس کے اگر کسی قوم کا یہ اعتقاد ہو۔ کہ نسلی اور پیدائشی طور پر دوسروں سے شرف میں کمتر ہے۔ تو یقیناً ایسی قوم پست ہمت ہو گی۔ اس کی جد و جہد میں قصور اور عقل و فہم میں فتور ہو گا۔ ایسی قوم کبھی درجۂ بلند تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس کی ہمت کا دائرہ بہت تنگ ہو گا۔

مذہب اسلام نے شرافت اور فضیلت کے دروازے کل انسانوں کے واسطے کھول دئے ہیں۔ علم و فضل کسی کا جدی ورثہ نہیں مانا بلکہ ہر شخص کو اس کا حق دار ٹھہرایا ہے۔ انسان کی شرافت علم و فضل سے وابستہ ہے۔ دوسرے ادیان میں یہ بات کم پائی جاتی ہے ....

(۳) وہ قوم ترقی کر سکتی ہے۔ جو اپنے معتقدات کی بنا مضبوط اور یقینی دلائل پر رکھے اور وہمیات اور ظنیات کو عقیدہ میں دخل نہ ہو۔ یا محض آبائی تقلید پر قانع نہ ہو۔ کیونکہ جو شخص کسی بات کو بلا دلیل

دلیل وحجت مانگے یا صرف آبائی تقلید پر اکتفا کرے تو اس کی عقل کند ہو کر غور وفکر سے معطل ہو جاتی ہے جب شخص ایک وجہ کی بجز سے عادی ہو کر آفات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مشہور فرانسیسی ڈریپر اپنی مشہور کتاب "مدنیت اقوام فرنگ" میں لکھتا ہے کہ یورپ کی تہذیب اس وقت شروع ہوئی جب یہاں ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جس نے یہ کہنا شروع کیا کہ اگرچہ ہم عیسوی مذہب کے پابند ہیں لیکن ہم کو یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ اپنے عقائد پر دلائل اور براہین طلب کر سکیں۔ پادری لوگ ان کو اجازت نہ دیتے۔ اور کہتے تھے کہ مذہب کی بنیاد تقلید پر ہے۔ آخر اس جماعت کے لوگوں نے زور پکڑا اور تقلید کے جال سے نکل کر میدان غور وفکر میں جولانیاں دکھائیں اور ترقی کے اسباب مہیا ہوتے۔

مذہب اسلام وہ بے نظیر مذہب ہے کہ بلا دلیل عقائد اور اتباع ظنیات کی مذمت کرتا ہے۔ آباؤاجداد کی کورانہ تقلید پر اسلام نے سخت سرزنش کی ہے اور ہر امر پر عقل سے اپیل اور دلیل طلب کی ہے۔ صم بکم عمی کو عقل کا نتیجہ اور شقاوت کو بے عقلی سے نسبت کرتا ہے۔ اسلام نے اصولی عقائد پر ٹھیک دلائل پیش کئے جو عوام کے واسطے مفید ہوں بلکہ اکثر احکام کے ساتھ ساتھ اس کی حکمت بھی ذکر کر دی ملاحظہ ہو قرآن مجید۔ کسی دوسرے مذہب میں یہ خوبی نہیں۔ اسلام کی یہ وہ خوبی ہے جس کا اعتراف غیر مسلم بھی کرتے ہیں

(۷) قوم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہیے۔ جو ہمیشہ تعلیم و تعلم میں مشغول رہ کر قوم کے ذہنی و ترقی اسباب معیشت اور وسائل دولت کو ترقی دیتا رہے۔ دوسرا گروہ ایسا ہو کہ قوم کی اخلاقی و روحانی تربیت کرتا رہے۔ اخلاق حسنہ کے فوائد اور اخلاق رذیلہ کے مضرات کو واضح کرے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے کسی وقت غافل نہ ہو کیونکہ انسان بے پرواہ نہیں ہو سکتا۔ چونکہ انسان کی خواہشات بے پایاں ہوتی ہیں۔ اگر ان کو اعتدال پر رکھنے والا نہ ہو۔ تو ظلم و تعدی کا مرتکب ہو کر امن عامہ میں خلل انداز ہوگا۔ بلکہ خود بھی نفسانی جذبات کی آگ میں جل کر خاکستر ہوگا۔ اور حیوانیت کی زندگی بسر کر کے آخر واصل جہنم ہوگا۔

پس امر بالمعروف و نہی عن المنکر دونوں ضروری امر ہیں۔ یہ دونوں باتیں اسلام کے فرائض و واجبات میں داخل ہیں (ملاحظہ ہو قرآن مجید) دوسرے مذاہب میں ان کی اس درجہ اہمیت نہیں۔ اسلام کے ارکان بہت ہیں۔ ان میں سے ہر ایک تمدن و معاشرت کے واسطے نہایت مفید بلکہ ضروری ہے........

اگر یہ کہا جائے کہ جب اسلام کے ایسے اصول ہیں۔ تو مسلمان کیوں ایسی ذلیل حالت میں گرفتار ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب مسلمان ان اصولوں کے پابند تھے۔ تو وہ ایسے تھے۔ جن کی زمانہ شہادت دے رہا ہے۔ لیکن اب پس اس کا جواب میں صرف قرآن شریف کی ایک آیت سے دیتا ہوں۔ "اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ" (سید جمال الدین افغانی)

جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ نظام عالم کی صحت اور دارومدار تغیر پر ہے۔ اور تغیر سے

اشیا ارتقا کی طرف مائل رہتی ہیں۔ اِس زریں اصول کے ماتحت یہ حقیقت آشکار ہو سکتی ہے کہ ذہن انسانی ایک زندہ جسم کی طرح ارتقا چاہتا ہے۔ ایک ہی قسم کے افکار و معتقدات فرو عی حیثیت سے ایک وقت خصائص نفسانی کے پیش نظر بے ہنگام ہو جاتے ہیں۔ ان کے معتقدات اساسی کے زندہ رکھنے کے لیے انسانی دل و دماغ کی پرورش کی ضرورت ہے۔ ماحول کے تغیر اور دل و دماغ کے ارتقا کے باوجود مسلسل ایک ہی قسم کے افکار و معتقدات کے معنی دل و دماغ کی نشوونما کو روکنا ہے۔ جس سے یقیناً ذہنی موت، واقع ہونے کا اندیشہ ہے۔ قومیں مختلف حیثیتوں سے اپنے لئے زوال کے اسباب پیدا کر لیتی ہیں۔ اور ان میں سب سے اہم سبب ذہنی نشوونما کو روکنا ہے جس سے معتقدات اساسی کی پرورش رک جاتی ہے۔ ذہن کے اِس فطری تقاضا کو پورا کرنے کے لیے اِسلامیات میں مسئلہ اجتہاد خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کی مدد سے ذہن اِسلامی کو ایک صحیح جسم کی طرح قائم رکھا جا سکتا ہے۔ اور افکار اِسلامیہ ہر زمانے میں تازہ رہ سکتے ہیں۔ قرآن میں بار بار اَفَلَا تَتَدَبَّرُوْنَ، اَفَلَا تَشْعُرُوْنَ، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کے الفاظ میں شدت سے خطاب کیا جاتا ہے۔

بزرگانِ دین نے اپنے اپنے فہم کے مطابق قرآن پاک سے اِسلام کو انفرادی نقطۂ نگاہ سے سمجھنے کی کوشش کی اور یقیناً ہم انتہائی ممنون ہیں ان کے نظریات کے پابند نہیں ہیں۔ قرآن ہمیں آزادانہ فکر کا حق عطا کرتا ہے۔ اگر ائمہ بزرگوار اعظمؒ، مالکؒ، حنبلؒ اور شافعیؒ کو اپنے زمانے کے مسائل کو قرآن کی روشنی میں حل کرنے کا حق حاصل تھا۔ ہم کیوں اپنے حق کو کھو بیٹھیں۔ ھُمْ رِجَالٌ وَنَحْنُ رِجَالٌ

دورِ جدید میں جب کہ مشرق و مغرب کے باہمی تقارب سے نئے نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ اور نظر و تفکر ذہنی کا وسیع تر دائرہ چاہتی ہے۔ ضرورت ہے کہ قرآن کے ہمہ گیر اور ابدی حقائق کو علوم حاضرہ کی مدد سے منصۂ شہود پہ لایا جائے۔ روحِ اِسلام کی تحقیق کے مسئلہ میں ہم دل و دماغ سے کام لینے میں آزاد ہیں اجتہاد کے معنی ذہنی شبستان میں شمعِ اِسلام کو زندہ رکھنا ہے۔

(بقیہ صفحہ) اب ظاہر ہے کہ جو حکومت اس قسم کے چھوٹے سے معاملہ میں بھی فکر کرسا منے آنے کی جرأت نہ کرے اور یوں ہی چھپتی، منہ چھپاتی پھرے۔

چو زاہدے کہ بہ بزمِ شراب می آید

وہ اپنی رعایا کے اندر کیرکٹر کی بلندی کس طرح پیدا کر سکتی ہے کہ الناس علیٰ دین ملوکھم ایک زندہ حقیقت ہے

ہم نے پچھلے سال اسی قسم کی معروضات، حکومت پنجاب کے جریدہ "استقلال" کے متعلق پیش کی تھیں جسے بعد "استقلال" کو بند کر دیا گیا (اگرچہ یہ امر بھی موجب تاسف ہے کہ اس کا اجرا بھی "اپنی" حکومت نے کیا تھا اور اسے بند کیا تھا ایک انگریز گورنر، سر کریک نے۔ یعنی اس نے محسوس کر لیا کہ یہ ایک غلط روش اور بے معنی بوجھ ہے، لیکن "اپنے" اس کا احساس نہ کر سکے)

نقد و نظر

حضرت امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی ہم جب سنا کرتے تھے کہ پرانے زمانہ میں فلاں صاحب نے بسم اللہ کی تفسیر میں ایک پوری جلد رقم فرمادی اور سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں دو دو جلدیں لکھ دیں تو حیرت ہوتی تھی کہ ان مختصر سے امور پر اتنا کچھ کیسے لکھا جاتا ہوگا۔ لیکن یہ بات سمجھ میں آگئی جب ہم نے اپنے دور کے ایک صاحب قلم کو لکھتے ہوئے دیکھا۔ یہ صاحب ہیں جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات کے صدر علامہ سید مناظر احسن صاحب گیلانی۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان سے کوئی ذرا سی بات پوچھئے وہ سلسلہ قسطوں کا مضمون رقم فرمادیں گے۔ خواہ اس مضمون کے اخیر پر خود ہی یہ بھی کیوں نہ لکھنا پڑے کہ "کہنے کی بات کل اتنی ہے۔ باقی جب لکھنے بیٹھا تو قلم پھر اختیار میں نہ رہا۔ جو کچھ لکھا گیا لکھتا چلا گیا" (صدق لکھنؤ مورخہ یکم جولائی ۱۹۴۳ء) معلوم نہیں کہ جن حضرات کو اپنے قلم پر بھی اختیار نہ ہو ان کی اس عنان گسیختہ بے اختیاری کو قوم کے لئے وجہ مصیبت کیوں بنا دیا جاتا ہے۔ گیلانی صاحب کی اسی قسم کی ایک کوشش بے اختیار زیر نظر کتاب کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ وہ خود تمہید میں لکھتے ہیں کہ جامعہ عثمانیہ میں اساتذہ کی ایک علمی مجلس تھی جس میں اساتذہ اپنے اپنے فن کے موضوع پر مقالے سنایا کرتے تھے۔ "جب خاکسار کی باری آئی تو اپنی کتاب تدوین فقہ کے ایک حصہ کا انتخاب کرکے مقالہ کی شکل میں متعدد مجلسوں میں اس کو پڑھتا رہا۔ یہ امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی کا تھا۔ یہ مضمون مختلف رسائل میں شائع ہوا۔ لیکن مضمون بہرحال نامکمل تھا۔ بعض لوگوں کے اصرار سے پچھلے دنوں اس مضمون کی تکمیل کا خیال پیدا ہوا۔ کتاب کی موجودہ ضخامت کا اندازہ پہلے نہ تھا۔ لیکن جب قلم اٹھا لیا گیا تو اس کا روکنا میرے بس میں نہ تھا۔ بس جہاں پہنچ کر وہ خود ہی رک گیا ہے میں نے بھی اپنے اس تالیفی سفر کو ختم کردیا" قارئین کو شکر گزار ہونا چاہئے اس اشہب قلم کا جو بڑی تقطیع کے ۴۹۳ صفحات پر جا کر رک گیا۔ ورنہ اگر وہ وہاں بھی نہ رکتا تو نہ جانے ہمیں آپ کو کہاں تک اس کا پیچھا کرنا پڑتا۔ ساری کتاب میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی سے متعلق صرف دو تین واقعات ہیں اور باقی مصنف کے اس بیان کی تائید کہ "جو کچھ لکھا گیا لکھتا چلا گیا۔" بہرحال اگر کوئی صاحب یہ دیکھنا چاہیں کہ بنی امیہ کے آخری اور بنی عباس کے ابتدائی ادوار حکومت میں سلطنت کے عام حالات کیا تھے تو اس کتاب میں انہیں کافی مسالہ مل سکیگا۔ بشرطیکہ وہ اس ذہنی انتشار اور بے ربطی کو گوارا کر لیں جس کی مظہر جناب مصنف کی تحریر ہے۔ کتاب نفیس اکیڈیمی، کراچی، کیماڑی سے شائع ہوئی ہے اور گٹ اپ فی الواقعہ بڑا جاذب ہے۔ قیمت مجلد آٹھ روپیہ بارہ آنے۔ مجلد چرمی بارہ روپیہ۔

جناب امام ابو حنیفہؒ دنیا کی ان ممتاز ترین ہستیوں میں سے ہیں جو اپنا مقام آپ پیدا کرتی ہیں۔ ان کی انفرادیت

ان کی سیاسی زندگی سے نہیں بلکہ بہ حیثیت امام فقہا (JURIST) کے ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ کوئی ایسا صاحب فکر جو سوانح حیات (BIOGRAPHY) لکھنا جانتا ہو اور تدوین فقہ کے تفصیلات سے بھی واقف ہو، جناب امامؒ کی ایک تحقیقی سوانح حیات مرتب کرے۔ مولانا شبلیؒ کی سیرۃ النعمان اس ضرورت سے مستغنی نہیں ہو سکتی۔

۲۔ منصب امامت انیسویں صدی کی تحریک جہاد کے داعیان میں حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا مقام بہت بلند ہے۔ ان حضرات کی زندگی میدان جہاد میں گذری اس لئے انہیں اتنی فرصت کہاں تھی کہ کتابیں تصنیف کرتے۔ مجاہد کو نہ اس کی ضرورت ہوتی ہے نہ فرصت۔ بایں ہمہ انہوں نے "منصب امامت" کے عنوان سے ایک مختصر سا رسالہ فارسی زبان میں قلمبند فرمایا تھا جس کا اردو ترجمہ حکیم محمد حسین صاحب علوی نے (موہن پورہ، راوی روڈ، لاہور) سے شائع کیا ہے۔ ہر چند ہمارے زمانہ کے ہنگامی مسائل اس زمانہ کے مسائل سے مختلف ہو چکے ہیں، بایں ہمہ یہ رسالہ ایک حیات بخش تحریک کے صاحب السیف و القلم کے جذبات کا مظہر ہے اس لئے اس قابل کہ اس سے استفادہ کیا جائے چونکہ حضرت شاہ صاحب کے استدلال کی بنیاد اکثر و بیشتر روایات پر ہے اور روایات کے معاملہ میں ہم محتاط واقع ہوئے ہیں اس لئے یہ ظاہر ہے کہ ہم متن کتاب کی ہر شق سے متفق نہیں ہو سکتے۔ لیکن یہ ایک الگ بات ہے۔ بہ حیثیت ایک مجاہد اور شہید کے حضرت شاہ صاحب اور حضرت سید احمد بریلوی علیہما الرحمۃ کی جو عظمت ہمارے دل میں ہے وہ ہم ہی جانتے ہیں

رسالہ کی قیمت غیر مجلد ۱۲؍ ہے اور مجلد ۱؍ (اس طرح لکھا ہے) ۱۵۲ صفحامت

۳۔ تاریخ انقلابات عالم ابو سعید صاحب بزمی ایم۔ اے۔ کی یہ تصنیف جو متوسط تقطیع کے قریب ساڑھے سات سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ کتاب منزل لاہور نے شائع کی ہے۔ یہ اس کتاب کی پہلی جلد ہے اور قیمت مجلد دس روپیہ۔

تاریخ کی تعبیر مختلف نظریوں کے ماتحت کی جاتی ہے اور ان میں ایک نظریہ معاشی ہے جسے کارل مارکس نے عام کیا ہے۔ اس تعبیر سے مفہوم یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں جس قدر مد و جزر واقع ہوا ہے۔ اس کے محرک ہمیشہ معاشی مسائل رہے ہیں۔ حتٰی کہ انسان کی تہذیب و مدنیت اور تمدن و ثقافت بھی "روٹی" کے مسئلہ کے ساتھ وابستہ رہے ہیں بزمی صاحب بھی مجموعی حیثیت سے اس تعبیر کے مؤید نظر آتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک مختلف انقلابات عالم کے محرکات عام طور پر معاشی مسائل ہی تھے۔ ان انقلابات میں حضرت نوحؑ سے لے کر ظہور اسلام تک کے زمانہ کی تاریخ پر چلتی ہوئی نگاہ ڈالی گئی ہے اور اس کے بعد یورپ کے انقلابات قریب پانچ سو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اور یہ داستان تفصیلی حیثیت سے ۱۸۱۵ء کی جنگ تک بڑھ آئی ہے۔ اس کے بعد کے واقعات و کوائف جلد دوم کے لئے چھوڑ دیئے گئے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ "روٹی" کا مسئلہ طبعی زندگی کی بقا کے لئے بڑا اہم مسئلہ ہے لیکن انسان کے سامنے فقط "روٹی" ہی کا مسئلہ نہیں۔ انسانی زندگی کے تقاضے "روٹی" سے اور آگے بھی ہیں اور

تاریخ میں جس قدر انقلابات صالح واقع ہوئے ہیں ان کے محرکات محض روٹی کے مسائل نہ تھے ان سے بلند کچھ اور بھی تھے۔

بہرحال یہ کتاب ان لوگوں کے لئے جو براہ راست انگریزی کتب تاریخ اور اسلامی تاریخ کے اصل ماخذ سے استفادہ نہیں کر سکتے مفید معلومات کا ذخیرہ اپنے اندر رکھتی ہے۔ بشرطیکہ اسے محض معلومات کی خاطر پڑھا جائے نہ کہ فلسفۂ تاریخ کی حیثیت سے۔ بہ حیثیت فلسفۂ تاریخ کتاب سطحی درجہ کی ہے۔

۴۔ **جب خون بہہ رہا تھا**: یہ بخاری صاحب کی تصنیف ہے اور کتاب منزل لاہور نے شائع کی ہے۔ چھوٹی تقطیع کے اڑھائی سو صفحات۔ اور قیمت مجلد تین روپے۔

یہ کتاب (بقول مصنف) "اس دلچسپ، دلگداز اور دلدوز دور کی مختصر تاریخ ہے جب آپ پاکستان کا خواب دیکھ رہے تھے۔ جب اس خواب کی تعبیر نظر آ رہی تھی اور جب یہ خواب حقیقت بن چکا تھا۔" اس کے بعد "مستقبل کے متعلق جو توقعات ہیں ان کی تفصیل اور اس راہ میں جو مشکلات حائل ہیں ان پر قابو پانے کے منصوبے۔"

جب آپ "پاکستان کا خواب دیکھ رہے تھے اور اس خواب کی تعبیر نظر آ رہی تھی" تو فاضل مصنف اس خواب کو دیوانے کا خواب اور اس تعبیر کو "دل کے بہلانے کا اچھا خیال" قرار دے رہے تھے۔ اس لئے کہ مصنف خود اپنے الفاظ میں "جون ۱۹۴۷ء تک لیگ کا ایک زبردست نکتہ چین رہا ہے۔" اور ۳ جون ۱۹۴۷ء تک تقسیم ہند کی تجویز کو خطرناک سمجھتا تھا۔ "لیکن اب پاکستان کے وقار کو اسلامی نظریۂ حیات کی واحد تعبیر سمجھتے ہوئے ایک لیگی سے بھی زیادہ اس بات کا قائل ہے کہ پاکستان کو ایک اٹل اور ابدی حقیقت کی طرح قائم رہنا چاہئے۔"

ہم کسی کی نیت پر حملہ نہیں کرنا چاہتے کہ دلوں کا جاننے والا وہ خدائے علیم و خبیر ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے جس کے لئے کسی علم غیب کی ضرورت نہیں کہ جس "خون ناحق" پر فاضل مصنف اب آنسو بہا رہے ہیں اس کی ذمہ داری زیادہ تر انہی مسلمانوں کے سر ہے جو محترم مصنف کی طرح ۳ جون ۱۹۴۷ء تک تقسیم ہند کی تجویز کو خطرناک سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کو اپنی دس سالہ جدوجہد کے دوران میں اپنی قوتوں کا حصہ انہی اپنوں کے ناوک دشنام کی مدافعت میں صرف کرنا پڑا اور انہی کی وجہ سے ملت اسلامیہ کے متحدہ مطالبہ کو اس قدر ضعف پہنچا۔ اب یہ "فتح مکہ کے بعد کے مسلمان" ان خون کی ندیوں کے سرچشمے دریافت کرنے کے لئے نکلے۔ اس باب میں ان سے، اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ

مشکل ہے پرسشِ غم کا، مگر اصرار نہ کر ... پوچھنے والے یہ تیرا ہی کہیں راز نہ ہو۔

۵۔ **ماہِ نو۔ خاص نمبر**: ماہوار مجلہ "ماہ نو" پر طلوع اسلام میں تبصرہ بہت پہلے شائع ہو چکا ہے۔ اس وقت اس رسالہ، یا اس کے زیر نظر خاص نمبر پر تنقید و تبصرہ مقصود نہیں بلکہ قارئین کی توجہ ایک اور حقیقت کی طرف منعطف کرانا مطلوب ہے۔ اس حقیقت کے باوجود

کہ "ماہ نو" حکومت پاکستان کا سرکاری پرچہ ہے۔ آپ شروع سے آخر تک دیکھ جائیے اس امر کا کہیں ذکر بلکہ اشارہ تک بھی آپ کو نہ ملے گا۔ لہٰذا اس ضمن میں پہلی "چوری" یہ ہے کہ حکومت ایک ماہوار رسالہ شائع کرتی ہے اور اسے اخفائے راز میں رکھتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس حقیقت کو مستور رکھنے کی ضرورت کیا ہے؟ اگر حکومت سمجھتی ہے کہ یہ مفید کوشش ہے تو اس کا کھلے بندوں اعلان کرے۔ اور اگر اس کے دل میں اس کے متعلق کوئی چور ہے تو اسے ختم کرے۔ یہ

دیتا وہ اس کا ساغر مے یاد ہے نظام — منہ موڑ کر ادھر کو، ادھر کو بڑھا کے ہاتھ

کی روش تو اصول دیانت کے یکسر خلاف ہے۔ پھر آگے بڑھئے۔ یہ پرچہ بڑی تقطیع کے قریب ۱۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ کاغذ اسپاٹ بیپر اور سفید ہے کہ آجکل کسی اعلیٰ پایہ کی کتاب کو بھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ طباعت کتابت، تصاویر سب قیمتی۔ اس کے باوجود قیمت سالانہ ۵ر اور فی پرچہ ۸ر ہے۔ ہم اپنے تجربہ کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ ادارت و نظامت وغیرہ کے اخراجات ملانے کے بعد یہ پرچہ کسی صورت میں بھی ڈیڑھ دو روپے سے کم میں نہیں پڑ سکتا۔ اب ظاہر ہے کہ جب فی پرچہ ۸ر وصول کئے جاتے ہیں تو باقی اخراجات، حکومت کے خزانہ سے ادا کئے جاتے ہیں۔ اور خزانہ میں روپیہ رعایا کا جمع کردہ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس پرچہ کی قیمت بلاواسطہ تو صرف ۸ر وصول کی جاتی ہے اور بالواسطہ ڈیڑھ دو روپے۔ یعنی خریدار کو فریب دیا جاتا ہے کہ تم سے صرف ۸ر وصول کئے جاتے ہیں۔ حالانکہ اس سے (ایک پاکستانی ہونے کی حیثیت سے) درحقیقت ڈیڑھ دو روپیہ وصول کئے جاتے ہیں۔ یہ دوسری "چوری" ہے اور اصول تجارت کے یکسر خلاف۔ اور اس کے بعد اس بات پر فخر کیا جاتا ہے کہ پرچے کی اشاعت اس قدر زیادہ ہے اور اسے پرچہ کی مقبولیت پر محمول کیا جاتا ہے۔ یہ خود فریبی ہے۔ پرچہ کی ضرورت، اہمیت اور مقبولیت کا صحیح اندازہ لگانا ہو تو حکومت کو چاہیے کہ پرچہ کو براہ راست پوری قیمت پر فروخت کرے اور پھر دیکھے کہ کس قدر بکتا ہے۔

رسالہ میں کچھ باتیں پاکستان سے متعلق ہیں اور باقی وہی ڈرامے، افسانے اور غزلیں۔ اس مخلوط انتخاب کی وجہ جواز یہ بتائی جائے گی کہ لوگوں کو ڈراموں، افسانوں اور غزلوں کی جاذبیت سے۔ پاکستانی معلومات پڑھا دی جاتی ہیں۔ بظاہر یہ طریق کار بڑا پُر حکمت دکھائی دیتا ہے۔ لیکن غور کیجئے کہ یہ کس قدر بودے پن کی دلیل ہے۔ اگر آپ پاکستان سے متعلق مضامین کو اتنا جاذب نہیں بنا سکتے کہ لوگ انہی کی خاطر انہیں پڑھیں تو یہ آپ کی اپنی کمزوری ہے جس کے لئے آپ خارجی آسرے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ یہ وہی دلیل ہے جو "تبلیغ اسلام" کے لئے "قوالی" کے حق میں پیش کی جایا کرتی تھی کہ اس سے غیر مذہب کے لوگ کھنچ کر اسلام کی طرف آجاتے ہیں۔ یہ تیسری "چوری" ہے اور اصول صحافت کے یکسر منافی۔

بقیہ ص

اسبابِ زوالِ امّت

سچ کہدوں اے مسلماں گر تو برا نہ مانے؟

"اسبابِ زوالِ امّت" پر غور وفکر کی دعوت چونکہ ہر صاحبِ فکر مسلمان کے لئے یکساں طور پر کھلی ہے اس لئے یہ اصولاً غلط ہوگا کہ اس دعوت کے جواب میں جو کچھ موصول ہو اسے من وعن شائع نہ کر دیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ بہت سے حضرات کے نتائجِ فکر سے آپ کو اختلاف ہو اور یہ بھی کہ خود ہمیں بھی اختلاف ہو۔ لیکن آخر الامر کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ مختلف الخیال حضرات کے نتائجِ فکر ہمارے سامنے ہوں۔ زیرِ نظر مقالہ اسی اصول کی رعایت سے بلا تنقید شائع کیا جا رہا ہے۔ ان تمام افکار و آراء پر محاکمہ و تبصرہ آخر میں کیا جائے گا۔

اس مضمون میں جگہ جگہ پر محسوس ہو رہا ہے کہ صاحبِ مضمون اپنے مافی الضمیر کو کما حقہٗ بیان نہیں کر سکے۔ اس لئے وہ کہیں اسلام کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ وہ اپنی طبعی عمر تک پہنچ کر فنا ہو گیا اور اب اس مردہ لاش میں از سرِ نو زندگی پیدا کرنے کی کوشش بیکار ہے۔ اور کہیں قرآن کو ملا اور صوفی کے چنگل سے نکال کر اس سے اپنے زمانہ کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے جدید نظریات و قوانین مرتب کرنے کی دعوت دیتے ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ صاحبِ مضمون کے نزدیک قرآن مردہ نہیں ہو چکا بلکہ اس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ ہمارے زمانہ کے تقاضوں کی تسکین کا سامان فراہم کر سکے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ان ہی میں سے ہوں جو اسلام کے مستقبل (مسلمانوں کے نہیں بلکہ اسلام کے مستقبل) سے ناامید ہو چکے ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ صرف ملا اور صوفی کے تراشیدہ اسلام سے متنفر ہیں اور حقیقی اسلام کو از سرِ نو بے حجاب کرنے کے متمنی۔

بہر حال یہ مضمون بھی ایک گروہ کی ترجمانی کر رہا ہے اور اس گروہ کی جو اسلام کی برتری اور مسلمانوں کے شان و تجمل کے آفتاب کو پھر سے علی الراس دیکھنے کا متمنی

ہے"۔ لہذا ہم حسن ظن سے کام لیتے ہوئے اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ صاحب مضمون اسلام کے مستقبل سے نا امید نہیں۔ لیکن چونکہ انہیں اظہار خیال پر قدرت نہیں اس لئے بعض مقامات پر مضمون بالکل مختلف مفہوم کا آئینہ دار بن گیا ہے۔ (طلوعِ اسلام)

آپ نے جو دعوت فکر مسلمانوں کو اسباب زوال اُمت کی دریافت کے متعلق اپنے موقر جریدہ "طلوعِ اسلام" کے ذریعہ دی ہے اور اس سلسلہ میں جو آراء مختلف اہل فکر نے قارئین رسالہ کے لئے پیش کی ہیں۔ یقینی طور پر نہایت مفید ہیں۔ استفادہ سے ہٹ کر اہل فکر حضرات کو کم از کم فکر کی دعوت تو ہے اور سائیکالوجی کے ایک طالب علم کے لئے مواد مطالعہ کی فراہمی۔ اس مسئلہ کے حل کے نیچے دلائل کی سیاہی کی کافی مقدار بہائی جا چکی ہے۔ مگر جہاں تک اقعیت کا تعلق ہے یا تو حقیقت کی طرف کوئی دیکھنا ہی نہیں چاہتا اور یا پھر رائے عامہ کے خوف کے پیش نظر کوئی حقیقت کے چہرہ سے نقاب کشائی کرنے کی ہمت نہیں کرتا۔ ان سب جوابات کی تان رجعت قہقری کی طرف ٹوٹتی ہے۔ مفکر حضرات بھی اس مسئلہ کے حل میں علماً طبقہ کے ہم نوا نظر آتے ہیں۔ اور علاج زوال امت کے لئے ایک ہی نسخہ پر متفق ہیں کہ اسلام کے عہد اوّل کی طرف واپس لوٹ چلو۔ مگر سب سے بڑا اہم سوال یہ ہے کہ جب بچہ بچہ اس راز سے واقف ہو چکا ہے کہ رجعت الی القرآن ورجعت الی عہد الرسول والخلافت ہی سے مسلمان دوبارہ نشاۃ ثانیہ حاصل کر سکتا ہے۔ تو پھر اس قدر بیّن طور پر راہ کے تعین ہو جانے پر اب کون سی رکاوٹ باقی رہ جاتی ہے کہ مسلمان اس شاہراہ ترقی پر جس کا چپہ چپہ دیکھا بھالا ہے گامزن نہیں ہوتے؟ اب مارچ کا بگل کیوں نہیں بجایا جاتا۔؟

سب سے بڑی مشکل کسی مسئلہ کے حل معلوم کرنے میں ہوا کرتی ہے۔ جب حل میسر ہو جائے فارمولا دستیاب ہو جائے تو پھر اس پر عمل کرنے میں کیا دقت باقی ہے؟ یا تو اب تک کوئی حل اس مسئلہ کا ہمیں نہیں ملا۔ اور ہم محض یونہی فلسفہ طرازی میں مصروف ہیں۔ اور یا پھر راستہ متعین ہو جانے کے باوجود تعطل اور جمود اس لئے ہے کہ ہمیں ترقی کی اصلی خواہش ہی نہیں اور ہم دنیا میں باقی اقوام کی طرح بام اوج پر پہنچنے کے صحیح طور پر خواہشمند نہیں ہیں۔ ورنہ کیمیا کے نسخہ کی دریافت کے بعد طلا سازی کی مہم کیوں جاری نہیں کی جاتی؟ مغرب کے لئے تو سخت افتاد یہ آن پڑی ہے کہ اُن کو کوئی صحیح راستہ ہی نظر نہیں آتا جس پر عمل کر کے وہ موجودہ تعطل اور تہذیب حاضرہ کے پیدا کردہ پیچیدہ گتھیوں کو سلجھا سکیں۔ ان کا مذہب اس بارہ میں واماندہ اور مجبور ہے۔ ان کی کوئی امداد نہیں کر سکتا۔ سائنس کی طرف وہ ہاتھ بڑھاتے ہیں تو سائنس اُن کو ایٹم بم جیسے مہلک کھلونے دے دیتی ہے کہ جاؤ اس سے ایک دوسرے کا سر پھوڑو۔ فلسفہ کی طرف آنکھ اٹھاتے ہیں تو فلسفہ ان سے خدا کا

تصور ہی چھین کر دہر پٹ پیش کر دیتا ہے۔ وہ تو ہند و رتہ تاریکیوں میں گھر گئے ہیں۔ مگر ہماری حالت تو ایسی نہیں۔ قرآن شریف جیسے آفتاب آسا مشعل روشن موجود ہے پھر ہم اس کے اُجالے میں کیوں آگے بڑھنے نہیں پاتے! کارواں کیوں رکا ہوا کھڑا ہے؟ جب قرآن ہمارے سامنے خلافت ارضی۔ غلبہ بر اقوام عالم۔ اور دنیا و مافیہا کی جملہ نعمتیں اپنی ہتھیلی پر رکھے ہوئے پیش کر رہا ہے کہ لے لو تو ہم کیوں آگے بڑھ کر اٹھا نہیں لیتے!۔ پیر و مرشد۔ مُلّا اور مولوی۔ عالم اور جاہل۔ بوڑھا بچہ۔ جوان۔ پڑھا ہوا اور ان پڑھ سب کے سب "شریعت شریعت" پکار رہے ہیں اور وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ہمارے موجودہ مصائب کا حل اسی میں ہے۔ تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کون ہم کو روکتا ہے کہ قرآن پر عمل نہ کریں۔ اب تو انگریز بھی بدر ہو چکا ہے۔ اس کی مزاحمت کا عذر لنگ بھی نہیں رہا۔

آپ نے کتنی دفعہ دیکھا ہوگا کہ ایک بوڑھا آدمی کس حسرت و یاس اور تڑپ سے یہ آرزو کرتا ہے کہ کاش کسی طرح سے پھر جوانی لوٹ آئے۔ کیا حکیم اجمل خاں جیسا مسیح وقت بھی اس کی یہ حسرت پوری کر سکتا ہے؟ کیا شاب و شباب کی طرف لوٹایا جا سکتا ہے؟ مسلمان ہمیشہ خوش اعتقادی کی بیماری میں مبتلا رہا اور اس خوش اعتقادی کے بحران میں سب بے تکی۔ غیر ممکن۔ اور لایعنی باتوں پر آمنا و صدقنا کہنے پر تیار۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ایک بڑے قانون قدرت سے سخت غفلت برتی ہے۔ مشیت ایزدی یہی ہے کہ وجود میں آنے والی سب اشیاء آہستہ آہستہ ترقی کر کے بام اوج پر پہنچیں۔ اور پھر گھٹتی گھٹتی بڑھاپے سے گزر کر فنا کے آغوش میں سو جائیں۔ خدا نے اس اصول کو کبھی نہیں بدلا۔ اپنے وقت کے بہت بڑے مذاہب اور ان کے بانی اولوالعزم پیغمبر پیدا ہوئے اور دنیا پر مسلط ہو گئے۔ مگر بالآخر انحطاط پذیر ہو کر فنا کی تاریکی میں چھپ گئے۔ حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت موسیٰؑ۔ حضرت عیسیٰؑ جیسے جلیل القدر انبیاء اس دنیا میں آئے جنکی نسبت اس عہد میں یہی سمجھا گیا کہ کائنات کی وجہ تخلیق ان ہی کی ذات بابرکات تھی۔ اور شاید کائنات کی آخری تان ان ہی پر ختم ہو جائے گی۔ اور دنیا کا چلتا چکر گھومنے سے رک جائیگا۔ مگر ان خدا کے پیارے نبیوں کو اور ان کے آوردہ مذاہب کو کون انحطاط اور فنا سے بچا سکا! وہ بھی تو خلیل اللہ تھے۔ کلیم اللہ تھے۔ روح اللہ تھے۔ خدا کی آنکھوں کے تارے۔ محبوب اور کیا کچھ نہ تھے مگر کیوں وہ اور ان کے مذاہب فنا کی دستبرد سے نہ بچ سکے اور ان کے عاشق خدا نے اُن کو اور ان کے پیارے مذاہب کو تخریب اور ورطۂ فنا سے بچانے کا کوئی بندوبست کیا۔ کتنے تعجب کا مقام ہے کہ ہم قدرت کے اس ارتقائی مارچ کو اسلام پر لا کر یکدم روک دیتے ہیں۔ حالانکہ کائنات تمام کی تمام آگے کو رواں دواں ہے اور کوئی شے ایک جگہ جم کر ساکن نہیں۔ زمان و مکان کا یہ دریا زنلاٹے بھرتا ہوا آگے کو رواں ہے اور کبھی رک کر چھیل نہیں بننے پاتا۔ پھر بھلا اسلام اس ابدی اور اٹل قانون سے کس طرح بچ سکتا تھا؟ سب سے

زیادہ جلیل القدر اور محبوب نبی بھی جب اور لوگوں کی طرح تولد ہوئے اور پھر اور لوگوں کی طرح وفات بھی پا گئے تو اور کوئی شے بھلا کس طرح پیدا ہو کر موت سے بچ سکتی تھی خواہ وہ مذہب ہی کیوں نہ ہو۔ مذہب بھی ایک طبعی عمر بسر کرتا ہے بچپن سے گزر کر ترقی پاتا ہے۔ پھر بوڑھا ہو کر فنا کی نیند سو جاتا ہے۔

یہ کوئی نیا راز نہیں جس کے انکشاف کا سہرہ چودھویں صدی کے مفکروں کے سر پر باندھا جائے۔ بلکہ آج سے بہت پہلے غالباً پہلی صدی ہی میں منکرین اسلام اس اصول سے باخبر ہو چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مذہب اسلام کی طبعی عمر کا اندازہ چودہ سو سال کا لگایا۔ مگر اسلام کے ساتھ والہانہ محبت کا تقاضا تھا کہ وہ اس جہاں تاب مذہب کے بڑھاپے اور موت کے تصور کو گوارا نہ کر سکے۔ پھر ان کو یہ ڈر بھی تھا کہ اسلام کے اس فنا کے بعد شاید اور کوئی نیا مذہب رونما نہ ہو جائے اور نبی آخر الزمان کے بعد پھر کوئی اور نبی اعلان نہ کر دے۔ اس لئے انہوں نے اس خوف سے تسلی حاصل کرنے کی خاطر یہ نظریہ پیدا کر لیا کہ چودھویں صدی کے بعد یہ کائنات ہی فنا ہو جائے گی۔ اور قیامت برپا ہو جائے گی۔ نہ دنیا رہے گی اور نہ نئے مذہب کی ضرورت پڑے گی۔ حالانکہ دنیا کے اثبات و استقرار کے باوجود بھی نئے مذہب اور نئے نبی کی ضرورت نہ تھی۔ پھر ان کو اس راز فنا معلوم ہونے کے بعد یہ خیال آیا کہ آخری صدیوں کے مسلمان اس انکشاف کی وجہ سے جد و جہد چھوڑ کر بے دست و پا ہو جائیں گے اور اس طرح سے قبل از وقت فنا اور بربادی کے شکار بنیں۔ لہذا اس زود بربادی کے شکار بننے اور ان کی اخلاقی قوت کو کمزوری سے بچانے کے لئے انہوں نے تخلیق مہدی کا نظریہ ایجاد کر لیا۔ اگر اسی مسئلہ کے حل ایجاد کرنے میں بہت جلد بازی سے کام نہ لیا جاتا تو شاید مسلمان اس غلط نظریہ کے مہلک اثرات سے بچ جاتا۔ مگر اُس وقت کے مسلمانوں کے پیش نظر مذہب عیسائیت تھا اور مسلمانوں نے مذہب اسلام کو عیسائیت کے تتبع میں بہت حد تک مسخ بھی کر لیا تھا۔ بنی اسرائیل اور عیسائی روایات و حکایات کے انبار سے بہت کچھ خرافات کو اپنا لیا گیا تھا۔ چنانچہ اس بارہ میں بھی مسلمانوں نے عیسائیوں کے نظریہ احیائے ثانی کے ڈھارس بندھانے والے مسیح موعود کے نمونے پر نبی اسلام کو تو پھر واپس لوٹا کر نہ لا سکتے تھے لہذا تخلیق مہدی کا فتنہ برپا کر دیا گیا۔ دراصل تخلیق مہدی تصور کی ایک عیاشی تھی جس نے ایک طرف مسلمانوں کے عمل کے دست و بازو شل کر دیئے اور دوسری طرف وقت کی عدالت میں یہ اعتراف شکست تھا کہ مسلمان باوجود زندہ اور تحریف و تاویلات سے محفوظ قرآن کی موجودگی میں بھی تنزل و ادبار سے نہیں بچ سکے۔ گویا قرآن شریف کا اثر زائل ہو چکا ہے اور مسلمان اب قرآن کے ذریعے احیاء ثانی حاصل نہیں کر سکتے۔ لہذا قرآن موجود ہونے کے باوجود مہدی پیدا ہو کر اپنے آمرانہ شخصیت کے بل بوتہ پر پھر مسلمانوں کو از سر نو زندگی بخش سکے گا۔

جب وہ آن کر کہے گا کہ قرآن کے اصولوں پر عمل کرو تو تب مسلمان قرآن پر عمل کر سکیں گے۔ اب نہیں کر سکتے۔ گویا دبی زبان سے مسلمانوں نے یہ اقبال کر لیا کہ اب اسلام مردہ ہو چکا ہے اور پھر مہدی اس لاش میں دوبارہ روح پھونک کر اس کو زندہ کرے گا۔

جب حقیقت یہ ہے تو پھر کھلے طور پر اس حقیقت کو تسلیم کر کے مردہ شے سے کسب حیات کے ناممکن العمل اصول سے ہٹ کر کسی اور طرف نظر کیوں نہیں اٹھائی جاتی۔ احیائے ثانی کا کوئی اور نسخہ کیوں تلاش نہیں کیا جاتا؟ یہ جرأت کیوں نہیں کی جاتی؟ آخر اتاترک نے تو بھی اس اصول سے آگاہ ہو کر .... مذہب کی طرف لوٹ جاؤ پر عمل کرنے کی بجائے سائنس کی طرف ساری توجہ مبذول کر دی اور اپنی قوم کے احیائے ثانی کے لئے موجودہ حاضر الوقت قوتوں سے امداد حاصل کی۔ شلوار کی جگہ پتلون اور پگڑی کی جگہ ہیٹ کھلے مغرب کی اندھی تقلید اور نقالی کا جوش اور شوق نہ تھا بلکہ مردہ ماحول سے نجات پا کر زندہ ماحول اور زندہ قوموں کے زندہ اشیاء سے کسب حیات حاصل کرنا مقصود تھا۔

اگر میں یہاں قلم روک لوں تو بہت بڑا اعتراض عائد کیا جائے گا کہ موجودہ کہنہ اور بوسیدہ عمارت کے منہدم کر دینے کی تجویز کے بعد نئے پلان اور نقشہ تعمیر کو پیش نہیں کیا گیا۔ لہٰذا یہ تو بدیہی امر ہے کہ جب تک کہنہ عمارت موجود ہے اس جگہ جدید عمارت استادہ نہیں کی جا سکتی۔ اور اس کہنہ بوسیدہ اور گرتی ہوئی عمارت کے سب سے زیادہ مضمحل بوسیدہ اور گرتے ہوئے ستون ملّا اور صوفی کو سب سے پہلے منہدم کرنا پڑے گا۔ کیونکہ خدا اور قرآن سے ہم کو بہت دور لے جانے اور خاص کر شرک جیسی ہلاک بیماری میں مبتلا کر دینے کی واحد اور ساری ذمہ داری ان ہی دونوں حضرات کے سر ہے۔ گو مذہب کے دسترخوان یغما پر سب سے زیادہ لطیف اور لذیذ پلیٹ نماز و روزہ ہی کی کیوں نہ ہو مگر ایک دق کے بیمار کی طرح کہ اس کو لذیذ اور مقوی غذاؤں سے تا صحت یابی محروم ہی رکھا جاتا ہے ہم کو بھی کچھ اسی طرح کے علاج کے طریقوں پر کاربند ہونا پڑے گا۔ قرآن شریف کے بحرِ بیکنار میں پھر سے غواصی کر کے آج تک چھپے ہوئے نئے اور جدید اصولوں کو تلاش کرنا ہو گا اور پھر ان پر غیر مولویانہ اور غیر متصوفانہ طرز عمل کی ضرورت ہو گی۔ جذبات اور خوش اعتقادی سے ہٹ کر دیکھا جائے تو اب مسلمانوں کو نہ ان کی نمازیں ابھار سکتی ہیں اور نہ پیر و مرشد۔ نہ مولوی اور جبہ و دستار اور نہ ملا کے بتلائے ہوئے پرانے نسخے۔ پرانی کونین بھی ملیریا کے جراثیم کو تباہ کرنے کی اہلیت کھو دیتی ہے۔ اب پھر قرآن شریف کی میٹریا میڈیکا سے کوئی اور نیا نسخہ تلاش کرنا ہو گا۔

اب زمانہ مذہبی ریاضتوں اور عبادتوں کا نہیں رہا۔ دنیا ارتقار کے شاہراہ پر ہزاروں منازل طے کر چکی ہے۔ افق سے نیا آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔ آنے والے وقت و زماں کے تیور ہی کچھ اور ہیں۔ اب پرانے ہتھیار کام نہیں آسکتے۔

یہ حکومت کا کام ہے کہ قوم کے سر سے کھوپڑی نکال دینے والے دو سب سے بڑے بھاری بوجھوں کو حکمران کو مولوی اور صوفی کی گرفت سے نجات دلائے تاکہ قوم اس گرانبار بوجھ سے سبکدوش ہو کر کچھ خود غور و فکر و تدبر سے کام لے سکے۔ قرآن شریف کی تعلیم دوبارہ اس طرح سے دی جائے جیسے رسول اکرم کے عہد میں ناخواندہ جاہل بدوؤں کو دی جاتی تھی۔ یعنی قرآن شریف اور صرف قرآن شریف کا لفظی آسان ترجمہ پڑھایا جائے اور تمام تفاسیر و تشریحات کے انبار در انبار سے ہم کو نجات دلائی جائے۔ اور بقول حکیم امت مرحوم مسلمانوں کی آنکھوں سے سرمۂ رازی دھو ڈالا جائے تاکہ صاف آنکھوں سے وہ حضرت قرآن شریف کو پڑھ اور سمجھ سکیں۔ کچھ عرصہ کے لئے بیمار اُمت کو حدیث و فقہ جیسی لذیذ مگر مُحرّک اور مرغن غذاؤں سے پرہیز کرایا جائے۔ اور قوم کے سامنے رجعت قہقری کی بجائے نئے آدرش۔ آئیڈیل مطمح النظر جو روشن واضح اور قابل حصول ہوں رکھے جائیں۔ تاکہ مسلمان یکدل ہو کر اس طرف بڑھے۔ اس مقصد کے لئے تعلیم کو عام کرنا پڑے گا۔ پانچ سال کے اندر پاکستان میں کوئی آدمی ایسا نظر آوے جو کم از کم اخبار بینی نہ کر سکتا ہو۔ آخر کیا وجہ تھی کہ خدا کے مقرر کردہ فرائض کے علاوہ رسول مکرم نے العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ کا اضافہ کرنا ضروری سمجھا۔

موجودہ طرز و شکل کا اسلام کسی مسلمان سلطنت کو زوال سے نہیں بچا سکا اور محکوم و مغلوب نہ ہونے کے باوجود بھی موجودہ آزاد اسلامی سلطنتیں عیسائی غلبہ سے کیوں نہ بچ سکے؟ اسلام کی روح کو نئے قالب اور سانچوں میں ڈھالنے کی ضرورت ہے۔ ہر اس شے سے پرہیز کرنا ضروری ہے جس سے کہنگی اور بوسیدگی کی بو آنے لگے۔ اور خاص کر ان طریقوں سے فوری پرہیز کی ضرورت ہے جو مُلّا اور صوفی تجویز کرے۔

بخوف طوالت میں نے نہایت اختصار سے کام لیا ہے اور بہت سی ضروری تشریحات کو چھوڑ دیا ہے اور اس لئے ڈر ہے کہ اس اختصار کی وجہ سے شاید صحیح مفہوم ہی پوری طرح سے ادا نہ ہو سکا ہو۔ تاہم اہل فکر کے سامنے اس مسئلہ کا یہ پہلو پیش کر دیا گیا ہے اور یہ دعویٰ نہیں کیا گیا کہ جو کچھ کہا گیا ہے ایک اٹل حقیقت ہے بلکہ یہ بھی ایک انسانی دماغ کے سوچ بچار کا نتیجہ ہے جو اسلام کی برتری اور مسلمانوں کی شان و تجمل کے آفتاب کو پھر سے علی الراس دیکھنے کا متمنی ہے۔ فقط

ترین

ذہنی غلامی

میں نے دیکھا کل ایک تیتر باز — جس کو اپنے کمال فن پر ناز
ہاتھ میں ایک دل فریب قفس — اور دروازہ اُس قفس کا باز
آگے وہ اور پیچھے اک تیتر — گرم رفتار و زمزمہ پرداز
میں نے پوچھا کہ طائر ناداں — آخر اس دل لگی کا ہے کیا راز
ہو کے بے تاب دوڑتا ہے تو — تجھ کو دیتا ہے جس طرف آواز
اُس نے آزاد کر دیا تجھ کو — اور اُسی کی طرف تری تگ و تاز
یہ کرشمہ ہے تیری خامی کا — یا کہ اُس پختہ کار کا اعجاز
ہوئے بیکار بال و پر تیرے — یا اُڑی دل سے خواہش پرواز
سُن کے تیتر نے کچھ جواب دیا — کان میں میرے آئی یہ آواز

"ہوں گرفتار الفت صیّاد
ورنہ باقی ہے طاقت پرواز"

اسد ملتانی

اِعلان

جولائی کے طلوع اسلام میں میں نے "آپ سے اپیل" کے عنوان سے موجودہ ادارہ کو ملی ادارہ بنانے کی تجویز پیش کی تھی۔ اس ضمن میں مجھے ابتداءً صرف دس شرکا کی شرکت درکار تھی الحمدللہ کہ توقع سے زیادہ درخواستیں برائے شمولیت موصول ہو چکی ہیں۔ چونکہ اکثر اصحاب نے بذریعہ خطوط تفصیل طلب فرمائی ہے اس لئے بذریعہ اعلان مستقبل کی تفصیل پیش کرتا ہوں۔

(۱) ادارہ کا نام (کتاب لمیٹڈ۔ کراچی) رکھا گیا ہے۔ یہ ادارہ قانونی طور پر لمیٹڈ ہوگا۔

(۲) اس کا منظور شدہ سرمایہ ایک لاکھ روپے ہوگا

(۳) ابتداءً فراہم شدہ سرمایہ دس ہزار روپیہ ہوگا جس سے کام شروع کیا جائے گا۔

(۴) ہر حصہ کی رقم مبلغ ایک ہزار روپیہ محدود ہے۔ یعنی کل حصہ دار صرف پچاس ہوں گے۔

(۵) اس لمیٹڈ ادارہ کا لین دین براہ راست حبیب بینک لمیٹڈ کراچی سے ہوگا۔

(۶) یہ ادارہ ایک سال میں کم و بیش چار کتابیں شائع کیا کرے گا جس کا مجموعی منافع اندازاً دس ہزار روپیہ ہو جایا کرے گا۔

(۷) میمورنڈم آف دی کمپنی میں پریس۔ امپورٹ۔ ایکسپورٹ اور سیل ایجنٹ تک کی اجازت ہوگی جس کے ماتحت یہ ادارہ نہایت وسیع پیمانے پر کاروبار کر سکے گا۔

(۸) میں (جے۔ بی۔ عارف) بحیثیت منیجنگ ایجنٹ رہونگا۔ باقی تمام معاملات بورڈ آف ڈائریکٹران کے مشورہ سے ہوا کریں گے۔ میمورنڈم اور آرٹیکل آف دی ایسوسی ایشن منگوانے کے لئے -/۱/-۲ ارسال فرمائیں۔

آپ کی اطلاع کے لئے یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس وقت تمام ضروری کاغذات پریس میں جا چکے ہیں۔ انشاءاللہ اسی ماہ میں یہ ادارہ قایم ہو جائے گا۔ اگر آپ کو ہمارے ادارہ کی حصہ داری منظور ہے تو ایک کارڈ کے ذریعہ ہم سے درخواست کا چھپا ہوا فارم منگوالیں۔ تاکہ اس کی خانہ پری کر کے آپ حصہ کی رقم بھی حاصل کر سکیں اور باقاعدہ طور پر شرکت بھی فرمالیں۔ سر دست ہر قسم کی خط و کتابت اس پتہ پر کریں۔ تفصیل صرف قانونی کاغذات میں سے مل سکے گی جو -/۲ روپے بھیجکر بہ حیثیت ممبر حاصل کر سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ اس ادارہ کو۔

عارف پبلشنگ ہاؤس۔ رابسن روڈ۔ کراچی